اے بی سی (آڈٹ بیورو آف سرکولیشن) کی مصدقہ اشاعت

لہٗ دعوۃ الحق

قرآن وسنت کی تعلیمات کا علمبردار

ماھنامہ الحق اکوڑہ خٹک

مدیر : سمیع الحق

جلد نمبر ۲۱
شمارہ نمبر ۲
صفر المظفر ۱۴۰۶ھ
نومبر ۱۹۸۵ء

فون نمبر
رہائش ۲
دار العلوم ۴
الحق ۴۰

اس شمارہ میں

نقشِ آغاز	سمیع الحق	۲
وفیات	"	۴
شرعی قوانین کی حفاظت اور دفاع	مولانا ابوالحسن علی ندوی	۶
صحبتے با اہلِ حق	شیخ الحدیث مولانا عبدالحق مدظلہٗ	۱۳
میں کیوں مسلمان ہوا ۔ ؟	خالد شیلڈرک / انسر حسن صدیقی	۱۹
اخوند درویزہ کی تصانیف	ڈاکٹر قاری عبدالغفور ایم۔اے ۔پشاور	۲۷
عصرِ حاضر میں اسلامی اقدار کی مناسبت	مولانا رحمت اللہ قاسمی ۔ انڈیا	۳۳
عباسی دور کی انفرادی بنکاری پر ایک نظر	ڈاکٹر ظفر الاسلام	۴۳
مولانا آزادؒ کتابِ زندگی کے چند اوراق	ڈاکٹر شیر بہادر خان پنی	۵۷

بدل اشتراک

پاکستان میں سالانہ	۴۰/- روپے	بیرون ملک بحری ڈاک	چھ پونڈ
فی پرچہ	چار روپے	بیرون ملک ہوائی ڈاک	دس پونڈ

سمیع الحق استاد دار العلوم حقانیہ نے منظور عام پریس پشاور سے چھپوا کر دفتر الحق دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ آغاز

اسلام دشمنی پر گٹھ جوڑ

دنیائے کفر کے عالمِ اسلام کے مقابلہ میں ملتِ واحدہ ہونے کی اطلاع صادق و مصدوق نبی آخر الزمان علیہ الصلوٰۃ والسلام نے چودہ سو سال قبل دی ہے۔ اس کی ایک واضح اور تازہ تصدیق امریکہ کے سابق صدر نکسن کے ایک حالیہ بیان سے ہو جاتی ہے۔ ملک و ملت کو متوجہ کرانے کے لئے احقر نے یہ مسئلہ تحریک استحقاق کے پیرایہ میں ۴ر دسمبر ۱۹۸۵ء کو سینیٹ میں اٹھایا بعض فاضل ارکان نے بھی اس پر اپنے خیالات کا اظہار کیا یہاں تحریک اور اس پر کچھ وضاحتی کلمات جو سینیٹ کی رپورٹنگ سے چھپا ہو سکے ہیں معاملہ کی اہمیت کے پیش نظر قارئین کے سامنے پیش کئے جا رہے ہیں:

مولانا سمیع الحق : ——— بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ، میں تحریک پیش کرتا ہوں کہ حسب ذیل معاملہ جس سے نہ صرف میرا بلکہ اس معزز ایوان کے سارے ارکان اور سارے پارلیمنٹ کا استحقاق مجروح ہوا ہے۔ کو زیرِ غور لایا جائے۔ امریکہ کے سابق صدر نکسن کے ایک مضمون بعنوان "سپر پاور سمٹری" امریکہ کے ایک اہم جریدہ فارن افیئرز میں شائع ہوا ہے۔ اور جسے نوائے وقت راولپنڈی مورخہ ۱۹ر نومبر ۱۹۸۵ء نے اپنے ہفتہ وار انگلش سیکشن میں بھی شائع کیا ہے۔ اس مضمون میں مسٹر رچرڈ نکسن نے روس کو مشورہ دیا ہے کہ اسلام کے نشاۃ ثانیہ کے خطرے سے دنیا کو بچانے کے لئے روس اور امریکہ کو متحد ہو جانا چاہئے اس مضمون میں انہوں نے دنیائے اسلام میں احیائے اسلام کی تحریکوں اور عالم اسلام کی جارحیت کے خلاف دفاعی کوششوں کو دہشت گردی کا نام دیا ہے۔ صدر نکسن کے مضمون کا ایک حصہ بطور نمونہ یہ ہے۔ مسٹر نکسن لکھتے ہیں:

"ان مسائل کو اپنے مفاد کے لئے استعمال کرنے کی بجائے سوویٹ یونین کو چاہئے کہ یونائیٹڈ سٹیٹ اور دوسری مغربی اقوام کے ساتھ مل کر ان کا مقابلہ کرے۔ سوویٹوں کو اسلام کے اساسی تحریکات کے ابھرنے سے خاص طور پر تشویش ہونا چاہئے۔ نہ صرف اس لئے کہ سوویٹ یونین کی ایک تہائی آبادی مسلمان ہے بلکہ اس لئے بھی کہ اسلامی انقلاب تیسری دنیا کی اقوام میں سوویٹ انقلاب سے کمپیٹ (مقابلہ) کرتا ہے۔"

وضاحتی تقریر | جناب چیئرمین صاحب! اس مضمون میں اسلامی انقلاب اور مسلمانوں کے نشاۃ ثانیہ کی کوششوں پر بے جا تشویش کا اظہار اور اس کے خلاف کمیونسٹ ملک کو متحد اور آمادہ کرنے کی صراحتاً ترغیب دی گئی ہے۔ اور مسلمانوں کے خلاف ایک منظم منصوبہ بنانے کے واضح مشورے ہیں۔ پاکستان جو عالم اسلام کا ایک اہم حصہ ہے۔ اور ایک اسلامی ملک ہے جو اسلام کے نشاۃ ثانیہ کے لئے کوشاں ہے۔ اس ملک کے نظریاتی

اساس کے خلاف یہ ایک سازش اور کھلی جارحیت ہے اور اس ملک کی پارلیمنٹ کے ایک رکن اور ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس مضمون سے میرے بھی جذبات شدید مجروح ہوتے ہیں اس لئے اس معاملہ کو زیر غور لایا جائے ۔ تو اسے وقت میں ان کا جو مضمون تھا وہ میں نے اس کے ساتھ بھیج دیا تھا ۔ جناب چیئرمین صاحب ایک تو کسی چھوٹے سے معاملہ میں یا ذاتی مسئلہ میں کوئی استحقاق ہوتا ہے ۔ جو مجروح ہو جاتا ہے ۔ یہ تو پورے عالم اسلام اور بالخصوص پاکستان جو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی کوششوں میں سرفہرست ہے ۔ اور اسکی جدوجہد جاری ہے پھر یہ ایک عام شخص کی رائے نہیں ہے کہ اس نے ایک ذاتی رائے دے دی ۔ بلکہ وہ ایک عظیم ذمہ دارانہ منصب پر رہا ہے ۔ اور آج بھی اس کے ساتھ کئی اہم ذمہ داریاں وابستہ ہیں ۔ چنانچہ صدر نہ ہونے ہوتے بھی پچھلے دنوں ان کا دورہ یہاں ہوا ۔ اور بڑے اہتمام سے ہوا ۔ اگرچہ حضور نے ہمیں ۱۴۰۰ سال پہلے خبردار کیا ہے کہ " الکفر ملۃ واحدۃ " یعنی کفر امت واحدہ ہے لیکن اس طرح کھل کر ایک ذمہ دار شخص کا سامنے آجانا جو ایک ملک کا سربراہ رہا ہے اور جو ہمارے ساتھ دوستی کا دم بھرتا اور حلیف ہونے کا دعویٰ دار بھی ہے ۔ مگر وہ اپنے بدترین دشمن کو خبردار کرتا ہے کہ تم اصل خطرہ اسلام سے محسوس کرو ۔ اور اسلام کی یہ نشاۃ ثانیہ آپ کے لئے خطرناک چیز ہے اور کمیونسٹ انقلاب کے لئے ہم مغربی اقوام خطرہ نہیں ہیں ۔ بلکہ اصل خطرہ اسلامی ممالک ہیں ۔ اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ ہے ۔ تو ہم سمجھتے ہیں کہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے جدوجہد کریں ۔ جس طرح کمیونسٹ کمیونزم کو پھیلانے کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں اور جارحیت بھی کر رہے ہیں اور سامراجیت سے کام لے رہے ہیں ۔ یہی حال مغربی اقوام کا ہے ۔

تو جناب ! یہ ایک اہم ترین مسئلہ ہے جس کا پوری پارلیمنٹ کو اور ایوان بالا کو نوٹس لینا چاہیئے ۔ اور اس کے بارے میں سوچنا چاہیئے اور نکسن سے پوچھنا چاہیئے کہ جناب آپ کے کیا عزائم ہیں ۔ آپ کھل کر کیوں نہیں کہتے کہ ہم اسلام کے دشمن ہیں ۔ میرے خیال میں آپ اس معاملے پر سنجیدگی سے نوٹس لیں ۔ اور ان سے وضاحت ملب کریں ۔ (بعض ارکان اور ایک وفاقی وزیر کی تقاریر کے بعد)

مولانا سمیع الحق : ——————— جناب چیئرمین صاحب ! جیسا کہ میرے فاضل دوستوں نے اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ۔ جناب وزیر صاحب نے فرمایا کہ یہ ایک دوسرے ملک میں ایک شخص کا بیان ہے تو میری رض یہ ہے کہ پارلیمنٹ صرف اندرونی سازشوں اور خطرات پر سوچتی نہیں ہے بلکہ اگر بیرون ملک بھی کوئی سازش تی ہے اور علی الاعلان کھلی جارحیت کے مشورے دئے جاتے ہیں تو اس کا فرض یہ ہے کہ ملک کے دفاع اور سلامتی کے لئے اس کا نوٹس لے ۔ اس وقت جبکہ خاص طور پر اس خطہ میں صورت حال یہ ہے کہ یہاں ایک طرف تو س علی الاعلان افغانستان کو ہڑپ کر چکا ہے اور ہزاروں شہریوں کو تہ تیغ کر رہا ہے اور لاکھوں مہاجر یہاں بیٹھے ہوئے ہیں ۔ اور امریکہ مجاہدین اور مہاجرین سے محبت کے دعوے بھی کر رہا ہے ۔ مگر دوسری طرف گویا روس

کو کہہ رہا ہے کہ ان کو کچل دو۔ بر وقت سختی سے ان کو ختم کر دو۔ یہ صورتِ حال ایسی ہے کہ گویا امریکہ کے ساتھ جس ملک کے بھی معاہدے ہیں اور وہ جن ممالک کا بھی اتحادی ہے، اس کا مطلب ہے کہ وہ سب کے ساتھ دوغلی پالیسی چلا رہا ہے۔ اس کی ہمدردیاں مہاجرین و مجاہدین کے ساتھ نہیں ہیں۔ وہ بظاہر مگر مچھ کے آنسو بہا رہا ہے۔ لیکن اندر سے وہ بندر بانٹ کر چکا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جب وہ روس کو یہ ترغیب دیتا ہے کہ ان کو کچل دو تو وہ اس ملک کو لبنان بنانا چاہتا ہے۔ جب وہ روس کو کہتا ہے کہ مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کو کچل دو۔ جبکہ مجاہدین کی ساری جدوجہد اسلام کی بقا اور نشاۃِ ثانیہ کے لئے ہے۔ مگر وہ کہہ رہا ہے کہ آؤ مل کر ہم ان کو ختم کریں۔ تو یہ جنگ اسی زمین پر لڑی جائے گی۔

تو میری عرض یہ ہے کہ یہ انتہائی خطرناک صورتِ حال ہے۔ اور ہمیں قدرت کا شکر گزار ہونا چاہیئے کہ اس شخص کی حقیقت اس نے ظاہر کر دی۔ اور اگر ہم بر وقت اس کا نوٹس نہ لیں تو میرے خیال میں اس سے پوری ملت مسلمہ کا استحقاق مجروح ہوگا۔ ہم میں سے ہر ایک ملتِ مسلمہ کا ایک فرد ہے۔ ہم ایک اکائی ہیں جب ہر فرد نوٹس لے تو خطرے کا انسداد ہوگا۔ اگر ہم فنی ضابطوں کی وجہ سے اس اہم ترین بات کو چھوڑ دیں تو وہ کہیں گے کہ سارے مسلمان بے حس ہو چکے ہیں اور وہ جاگتے ہی نہیں ان کو جلدی ختم کر دو۔

واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل۔

سمیع الحق

وفیات

امتِ مرحومہ کے ادبار و زوال، قحط الرجال اور ملی انتشار کے اس پر آشوب دور میں گذشتہ چند ہفتوں سے یکے بعد دیگرے اکابر علماء نے ملت کو داغِ مفارقت دیا۔ مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر دیوبند مولانا فاضل حبیب اللہ رشیدی ساہیوال اور صاحبزادہ عبدالباری جان چارسدہ کے حادثۂ وفات سے ملت کو بھاری نقصان پہنچا اور یہ سانحات علم و عمل زہد و تقویٰ جوش و جذبہ، اشاعت و تدریس تصنیف و تالیف کی دنیا کیلئے ایک بڑا خلاء ثابت ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ملت کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے

مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر علامہ انور شاہ کشمیری کے فرزند اور اکابر علماء دیوبند کی علمی نسبتوں کے امین تھے، مدتوں مرکز علم دار العلوم دیوبند کے ماہنامہ رسالہ دار العلوم کے مدیر اور اب ماہنامہ طیب کے ایڈیٹر تھے وہ ایک وسیع النظر صحافی اور ادیب تھے، موصوف کی ساری زندگی علم کی خدمت، دین کی اشاعت، حق گوئی

صداقت اور تحریر و تصنیف میں گذری ، ان کے گرانقدر دینی خدمات ، تصنیفات بالخصوص ماہنامہ دار العلوم میں ان کی علمی کاوشوں کی پوری تاریخ ایک صدقہ جاریہ اور امت کیلئے راہ راست کا سنگ میل ہوں گی ۔

حضرت مولانا فاضل حبیب اللہ رشیدی | ایک تحریک ، جہد مسلسل ، ان تھک کوشش ، اخلاص و محبت ، ایثار و قربانی علم و عمل سے متصف ایک ایسی عظیم شخصیت کا نام ہے جس نے ابتلاء و آزمائش کے ہر دور میں دین کی بالادستی اور اعلاء کلمۃ اللہ کی خاطر ذاتی مفادات اور راحت و آرام کو تج کر خود کو معرکۂ حوادث کی نذر کر دیا ۔ موصوف تحریک ختم نبوت اور تحریک نظام مصطفیٰ کے سرکردہ رہنماؤں میں سے تھے ۔ قید و بند کی صعوبتیں خندہ پیشانی سے برداشت کیں ۔ جامعہ رشیدیہ ساہیوال اور ماہنامہ الرشید مرحوم کا عظیم صدقہ جاریہ اور ایک تاریخی نیز علمی و روحانی یادگار ہیں ۔

مولانا صاحبزادہ عبدالباری جان صاحب | ایک بیباک ، حق گو اور نڈر عالم تھے ۔ صوبہ سرحد میں جمعیۃ علماء اسلام کی تنظیم کو فعال بنانے میں ان کا کردار مثالی تھا ۔ اخلاص و محبت اور ایثار و قربانی کے پیکر تھے وہ سرحد میں جمعیۃ کے اصل بانیوں میں سے تھے ۔ طبعاً حد درجہ متواضع ، خلیق ، ملنسار اور خاکسار تھے حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کے تلمیذ تھے ۔ اور زندگی کے آخری لمحات تک اس رشتۂ تلمذ کے تقاضوں کو نباہتے رہے اور یہ ان کے اس اخلاص و محبت کی برکت تھی کہ حضرت شیخ الحدیث مدظلہ علالت و ضعف کے باوجود ان کے جنازہ میں شریک ہوئے اور نماز جنازہ پڑھائی ۔

حضرت شیخ الحدیث مدظلہ ادارۂ الحق حقانی فضلاء اور یہاں کی علمی برادری تینوں بزرگوں کے خواص متعلقین ورثاء ، تلامذہ کے ساتھ غم اور تعزیت مسنونہ میں برابر کے شریک ہیں کہ یہ حوادث علم کے حادثے ہیں اور پوری امت کا حادثہ ہے ۔

علماء پیدا ہو رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے مگر دنیا کا رنگ دیکھتے ہوئے ایسے متقی ، پاکباز وسیع المشرب مجاہد ، سرفروش اور مخلص علماء کے پیدا ہونے کی توقع کم ہے ۔

حق تعالیٰ مرحومین کو درجات عالیہ سے نوازے ۔ آمین ۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

شرعی قوانین کے نفاذ اور دفاع کا مسئلہ

——— مسلمانوں کی ذمہ داری

ذیل میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی تقریر شائع کی جارہی ہے جو کلکتہ میں ہونے والی مسلم پرسنل لاء کانفرنس کے موقعہ پر ہونے والے عام جلسہ میں کی گئی تھی، جس میں پانچ لاکھ کا مجمع تھا گنجائش کی کمی کی وجہ سے معمولی سے حذف و اختصار سے کام لینا پڑا ہے۔ مولانا کے مخاطب اگرچہ انڈیا کے مسلمان ہیں مگر اس وقت پاکستان میں بھی شریعتِ اسلامی کے سلسلہ میں لادین عناصر کی وجہ سے یہی حالات درپیش ہیں۔ ان حالات میں پاکستانی مسلمانوں کو بھی اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرنا چاہیئے۔

(ادارہ)

———★———

حضرات! اس وقت ہندوستان میں رہ رہ کر مسلم پرسنل لاء یعنی مسلمانوں کے عائلی قانون میں آئین سازی کے ذریعہ مداخلت کا مسئلہ اٹھتا رہتا ہے۔ اور ملک کے حصوں سے آوازیں بلند ہوتی رہتی ہیں۔ غیر مسلموں کی طرف سے بھی (جن سے ہمیں کچھ زیادہ شکایت نہیں) مسلمانوں کی ترقی و تجدد پسند طبقہ کی طرف سے بھی۔

اس کے بہت سے اسباب بیان کئے جا سکتے ہیں اور وہ صحیح ہوں گے۔ لیکن میں ایک مذہبی انسان ہونے کے ناتے نیز مذہب کے طالب علم اور قرآن و سیرت کا مطالعہ کرنے والے انسان کی حیثیت سے اس کا کچھ اور سبب سمجھتا ہوں۔ کسی بزرگ کا مقولہ ہے کہ

"جب مجھ سے اپنے مالک، اپنے خدا کے معاملہ میں کوئی کوتاہی ہوتی ہے۔ میرے رات کے معمولات میں فرق آتا ہے جس وقت میں اٹھتا ہوں، جتنی رکعتیں پڑھتا ہوں، خدا کو جس طرح یاد کرتا ہوں، اس سے دعا کرتا ہوں اس کے سامنے روتا دھوتا ہوں۔ اس میں جب کوئی کمی ہو جاتی ہے تو میں فوراً اس کا نتیجہ دیکھ لیتا ہوں۔ اس کا نتیجہ کیا دیکھتا ہوں؟ یہ کہ میرے ملازمین میری بات اس خوش دلی کے ساتھ نہیں مانتے جس طرح پہلے مانا کرتے تھے یہاں تک کہ جب میں سواری پر بیٹھنے لگتا ہوں تو میں دیکھتا ہوں کہ گھوڑا اس طرح اپنی پیٹھ نہیں جھکاتا اور اس طرح مجھے قبول نہیں کرتا جیسے وہ ہمیشہ قبول کرتا رہا ہے۔ میں سمجھ جاتا ہوں کہ میں نے اپنے مالک کے حق میں کوتاہی کی تو یہ جن کو اللہ نے میرے اختیار میں دیا ہے مجھ سے سرتابی کر رہے ہیں۔ میرے چٹکی لے رہے ہیں۔ کہ تم نے اپنے

آقا کے معاملہ میں کوتاہی کی، تم تو ہمارے آقائے مجازی ہو ہم تمہارے معاملہ میں کوتاہی نہیں ستابی کریں گے"
کتابوں میں ان کے الفاظ بعینہٖ نقل کئے گئے ہیں۔

اعرف ذلك في خلق دابتي وخدمي مجھے اپنی اس کوتاہی کی نحوست اپنے جانوروں اور ملازمین کے طرز عمل میں نظر آجاتی ہے۔

کسی واقعہ کے کچھ اسباب ظاہری ہوتے ہیں جن کو ظاہری آنکھیں دیکھتی ہیں۔ کچھ اسباب غیبی ہوتے ہیں جن کو قرآن مجید، سنت اللہ، اسوۂ رسول ﷺ و سیرت النبی کی روشنی میں دیکھا جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ جرأت بار بار اس لئے ہو رہی ہے کہ ہم سے اللہ کے اس مقرر کئے ہوئے مقدس قانون کی پابندی میں اور اس پر عمل کرنے میں شدید کوتاہی ہو رہی ہے۔ ہم اس قانون کو اپنے گھروں میں توڑ رہے ہیں۔ اپنے خاندانوں میں توڑ رہے ہیں اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی یہ سزا دے کہ وہ قانون پھر قانونی طور پہ توڑا جائے۔ یہ خدا کے طریقے ہوتے ہیں۔ وہ کبھی براہ راست سزا دیتا ہے کبھی اپنی مخلوقات اور اپنے بندوں کے ذریعے سزا دلواتا ہے۔ یہ عناصر اربعہ، یہ بحر و بر، یہ خشکی و تری یہ موسم اور طاقتیں جو اس کائنات میں کام کر رہی ہیں ولله جنود السموت والارض یہ سب خدائی لشکر ہیں، پہلے ہم اس قانون کی حرمت اور اس قانون کا احترام اپنے گھروں میں کریں۔ زوجین اپنے آپس میں کریں، میاں بیوی اپنے تعلقات اور ان حقوق و فرائض میں کریں جو ان پر عائد ہوتے ہیں۔ ترکہ و میراث کے قانون میں اس کا احترام کریں، اس کی پابندی کریں۔ نکاح و طلاق کے مسائل میں اس پر عمل کریں پھر کسی کی مجال نہیں کہ دنیا میں وہ اس قانون کو چیلنج کر سکے گردنیں جھک جائیں گی۔ اور ساری دنیا سرافگندہ ہو جائے گی بلکہ اس کو شوق ہوگا کہ وہ آپ کے قانون پہ چلے۔

لیکن جب ہم اس قانون کو اپنے گھر میں توڑیں گے تو پھر دوسروں سے توقع نہیں کر سکتے کہ وہ ہمارے قانون کا احترام کریں۔ آج آپ اپنا جائزہ لیجئے۔ دیانت دارانہ جائزہ لیجئے۔ آپ خود اپنے محتسب بنئے۔ اور اپنے لئے اپنے گھروں میں عدالتیں قائم کیجئے۔ اپنے مقدمے خود دائر کیجئے آپ ہی مدعی بنئے اور آپ ہی مدعا علیہ اور دیکھئے کہ کتنے خدائی قانون ہیں کتنے قرآن مجید کے منصوصات اور قطعیات ہیں جن میں دنیائے اسلام کے دو عالموں کے درمیان بھی اختلاف نہیں۔ ان کو آپ کس طریقے سے نظر انداز کر رہے ہیں۔ آپ نے اپنی بہنوں کو والدین کی میراث (ترکہ) سے ان کا حصہ دیا؟ آپ نے نکاح و طلاق کے حق کو اس طرح استعمال کیا جس طرح اللہ اور اس کا رسول ﷺ چاہتا ہے؟ کیا مسلمان شوہر نے اپنی بیوی کے اور مسلمان بیوی نے اپنے شوہر کے حقوق ادا کئے؟ کیا آپ کو مسائل کا علم ہے؟ تفصیلی علم تو بڑی چیز ہے یہ علماء کا کام ہے۔ لیکن کیا آپ کو موٹی موٹی باتیں بھی معلوم ہیں، یہ ہمارا طرز عمل اس قانون کے معاملہ میں ہے۔ اس کی ہماری نظر میں (معاذ اللہ) پر کاہ کے

برابر بھی قیمت نہیں۔ ہم ایک ادنیٰ مفاد کے لیئے ادنیٰ درجہ کے فائدہ اور راحت کے لیئے اس قانون کو پامال کرتے ہیں۔ اس قانون کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں تو ہمیں دوسروں سے کیا شکوہ؟

آج میں اس مجمع عظیم کو ایمانی زبان۔ قرآنی زبان میں خطاب کرتا ہوں، آپ کی عملی زندگی کا محاسبہ کر رہا ہوں آپ خود دیکھئے کہ آپ اس قانون کا کتنا احترام کرتے ہیں، اس پر خاندانی روایات کو اور رسم و رواج کو کتنی ترجیح دیتے ہیں پھر اس پر اس کا اضافہ کیجئے جو آپ نے اپنے ہم وطنوں سے سیکھا ہے۔ جہیز میں بڑھا چڑھا مطالبہ ہم میں کہاں سے آیا؟ اس کو کسی نام سے یاد کیا جائے، یہ چیز کہاں سے آئی؟ یہ لعنت کہاں سے آئی؟ جب آپ اس کو قبول کرتے ہیں تو اللہ بطور سزا آپ کی غیرت ملّی کو، آپ کے وجود ملّی کو پارہ پارہ نشانہ بناتا ہے۔

ایک ایسا آدمی جس کو اللہ تعالیٰ نے دین کی سمجھ عطا فرمائی ہے اور جو یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ علام الغیوب ہے اور اللہ تعالیٰ ہی کے قبضہ میں انسانوں کے قلوب ہیں، وہ ہمیشہ جب کوئی مصیبت پیش آتی ہے، اس کو اپنے گناہ کا نتیجہ سمجھتا ہے۔ قرآن شریف میں صاف صاف ہے۔

وَمَا اَصَابَکُمْ مِّنْ مُّصِیْبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَتْ اَیْدِیْکُمْ وَیَعْفُوْا عَنْ کَثِیْرٍ ۝

(الشوریٰ ۳۰)

تم پر جو مصیبت آتی ہے وہ تمہارے ہاتھوں کی لائی ہوتی ہے، وہ تمہارے عمل کا نتیجہ ہوتا ہے (یہ بھی ایسی حالت میں ہے) کہ اللہ تعالیٰ بہت کچھ عفو و درگذر سے کام لیتا ہے۔

دوسرا قرآن میں یہ بھی ہے۔

وَلَوْ یُؤَاخِذُ اللّٰہُ النَّاسَ بِمَا کَسَبُوْا مَا تَرَکَ عَلٰی ظَھْرِھَا مِنْ دَآبَّۃٍ وَّلٰکِنْ یُّؤَخِّرُھُمْ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُھُمْ فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِعِبَادِہٖ بَصِیْرًا ۝

(فاطر ۴۵)

اگر اللہ تعالیٰ پکڑنے لگے انسانوں کو ان کے عملوں پر تو سطح زمین پر کوئی چلنے والی اور رینگنے والی چیز باقی نہ رہے لیکن وہ ان کو ایک وقت مقرر تک مہلت دیتے جاتا ہے سو جب ان کا وقت آجائے گا (تو ان کے اعمال کا بدلہ دے گا) خدا تو اپنے بندوں کو دیکھ رہا ہے۔

بہت کچھ معاف کر دینے کے بعد اور درگذر کرنے کے بعد بھی معصیت کا، قانون شکنی کا اثر ظاہر ہوتا ہے تو ہم جس بات کی شکایت کرتے ہیں (اور بجا طور پر شکایت کرتے ہیں) وہ شکایت بجا ہے۔ ہم شکایت کرتے رہیں گے۔ اور شکایت کرنا ہمارا حق ہے۔ ایک جمہوری ملک میں جہاں قانون چلتا ہو، جہاں ہر شہری کو برابر

کا حق دیا گیا ہو۔ وہاں ہر شہری کو اور شہریوں کی ہر تنظیم کو اور آبادی کے ہر عنصر کے نمائندوں کو یہ حق ہے کہ پارلیمینٹ (ایوان قانون ساز) میں اپنے قومی عوامی جلسوں میں، اپنی مجلسوں میں اور اخبار کے کالموں میں وہ اس بات کی شکایت کریں کہ ہمارا فلاں حق نہیں مل رہا ہے۔ ہمارے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے۔ اس لئے ہم اپنی حکومت سے شکایت کریں گے۔ اور سو بار کریں گے۔

ہم ہمیشہ اپنے آئین ساز بھائیوں اور ارکان حکومت سے، انتظامیہ ADMINISTRATION اور حکمراں جماعت سے شکایت کریں گے۔

لیکن جب ہم اہل حکومت اور برادران وطن سے شکایت کرتے ہیں تو ہمیں آپ سے شکایت کرنے کا حق کیوں نہ ہو؟ ان سے تو شکایت ہی کریں گے۔ اور ان کا دامن ہی پکڑیں گے۔ لیکن آپ کا گریبان پکڑ لیں گے اور وہ ہاتھ ہمارا ہاتھ نہیں ہوگا وہ دینی احتساب کا ہاتھ ہوگا۔ وہ شریعت کا ہاتھ ہوگا جو آپ کا گریبان پکڑے گا اور کہے گا پہلے تم اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو کہ تم اس قانون پر کتنا چلتے ہو۔ تمہاری نگاہوں میں اس قانون کی کتنی حرمت ہے؟ تم جہاں اس قانون کو چلا سکتے ہو وہاں چلا رہے ہو کہ نہیں؟ تم تو اپنے گھروں میں اس قانون کو نہ چلاؤ اور حکومت سے مطالبہ کرو کہ وہ تمہارے قانون کو چلائے۔ اس کا احترام کرے۔

میں آپ سے ایک بات کہتا ہوں، یہاں سے یہ عہد کر جائیے کہ اب قانون شریعت پر آپ چلیں گے، یہ جہیز کی کیا مصیبت ہے؟ لڑکے والوں کی طرف سے مطالبات کی ایک لمبی چوڑی فہرست پیش ہوتی ہے، شرائط پیش کی جاتی ہیں۔ ان کے پورا نہ ہونے پر یہ معصوم لڑکیاں جلا دی جاتی ہیں۔ ملک میں سینکڑوں واقعات پیش آتے ہیں۔ صرف دہلی میں ہر بارہ گھنٹے پر ایک نئی بیاہی دلہن کو جلا کر مار ڈالا جاتا ہے[1]

کیا اس کائنات کے خالق اور نوع انسانی کے مربی (جس کی مخلوق مرد و عورت دونوں ہیں) کو یہ چیز گوارا ہو سکتی ہے؟ کیا اس ظلم کے ساتھ ملک کا کوئی معاشرہ پنپ سکتا ہے، خدا کی رحمت و نصرت کا مستحق ہو سکتا ہے؟ آپ رحمت للعالمین کی امت ہیں، آپ کے ہوتے ہوئے دوسروں کو بھی اس کی ہمت نہیں ہونی چاہئے تھی۔ میں نے دہلی کے ایک جلسہ میں کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ۔ (انفال ۳۳)	اور خدا ایسا نہ تھا کہ جب تک تم ان میں تھے انہیں عذاب دیتا، اور نہ ایسا تھا کہ وہ بخشش مانگیں اور انہیں عذاب دے۔

---

[1] قومی آواز دہلی ۱۰ر جون ۱۹۸۴ء

آج رحمۃ للعالمین ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن رحمۃ للعالمین کی امت موجود ہے۔ آپ رحمۃ للعالمین کی امت ہیں۔ آپ کے ہوتے ہوئے ہندوستانی سماج میں ہندوستان کے معاشرہ اور سوسائٹی میں یہ ظلم ہو۔ اس کو عقل قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ آپ کے ہوتے ہوئے بھی یہ نہیں ہونا چاہئے تھا۔ چہ جائے کہ آپ کے ہاتھوں ہو۔ عہد کیجئے کہ آپ اسلامی طریقہ پر شریفانہ انسانی طریقہ پر۔ شادی کا پیام دیں گے۔ آپ لڑکی مانگیں گے، اپنے لئے رفیقۂ حیات تلاش کریں گے۔ بیٹے کے لئے پیام دیں گے۔ جہیز کے لئے آپ کے بڑھے چڑھے مطالبات نہیں ہوں گے کہ ہمیں یہ ملنا چاہئے، وہ ملنا چاہئے۔ لڑکوں کو اور ان کے وارثوں اور بزرگوں کو اس کا عہد کرنا چاہئے کہ ہم اپنے یہاں تو کیا ہم اس ملک سے اس رسم کو ختم کریں گے۔

ایسے ہی ترکہ شرعی طریقہ پر تقسیم ہونا چاہئے۔ نکاح شرعی طریقہ پر ہونا چاہئے۔ اور عورتوں کی بیویوں کی تعداد وہی ہونی چاہئے جو شریعت میں بیان کی گئی ہے۔ طلاق کا مسنون طریقہ معلوم کرنا چاہئے۔ مسنون اور افضل طریقہ کیا ہے؟ پھر اس کے بعد فقہی طلاق جس سے طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ اس کو سمجھنا چاہئے کہ طلاق رجعی کیا ہوتی ہے؟ طلاق بائن ومغلظہ کیا ہوتی ہے؟ پھر اس میں طلاق کو آپ یہ سمجھیں کہ طلاق اَبغضُ المباحات ہے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جائز ہے لیکن آخری درجہ کی چیز ہے۔ بڑی مجبوری کی چیز ہے جو اپنے کو حرام چیزوں سے اور زندگی کو تلخ بننے سے بچانے کے لئے بہت مجبوری سے دل پر پتھر رکھ کر اختیار کی جاتی ہے۔ یہ نہیں کہ طلاق ایک فیشن ہو گیا ہے۔ جو لوگ مسلمانوں کو یہ طعنہ دیتے ہیں اس میں تھوڑی سی ہماری کوتاہی کو بھی دخل ہے۔ جتنا طعنہ دیتے ہیں اتنے کے مستحق تو ہم ہرگز نہیں ہیں[1]

ہم جانتے ہیں کہ یورپ میں کیا ہوتا ہے؟ وہاں کا معاشرہ کس طرح برباد ہو رہا ہے۔ وہاں ساری عمر ناجائز طریقہ پر جنسی تعلق قائم رکھنا جائز ہے۔ کوئی اس کو نہیں ٹوکتا۔ لیکن طلاق دینا معیوب ہے۔ اور اس میں ہزار دقتیں ہیں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟ ہم اپنے قانون سے ہرگز شرمندہ نہیں۔ ہم اس کے ایک ایک نقطہ کی ذمہ داری لینے کے لئے تیار ہیں۔ ہمارے علماء نے اس پر ایک کتب خانہ تیار کر دیا ہے۔

"مجلس تحقیقات ونشریات اسلام" (ACADEMY OF ISLAMIC RESEARCH & PUBLICATIONS. NADWATUL-ULAMA-LUCKNOW) ندوۃ العلماء لکھنؤ، امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ اور مسلم پرسنل لاء کا مرکزی دفتر واقع مونگیر برابر لٹریچر شائع کرتا رہتا ہے۔ عربی میں تو پوچھنا ہی کیا اس میں علامہ عباس محمود العقاد، ڈاکٹر مصطفےٰ السباعی کی عورتوں کے حقوق پر اور اسلام میں عورتوں کے درجہ

---

[1] مسلمانوں میں طلاق کی شرح وہ نہیں ہے جو بیان کی جاتی ہے اس میں مبالغہ اور رنگ آمیزی سے کام لیا جاتا ہے پھر بھی خاصی بے اعتدالی اور زیادتی

ایسی معرکۃ الآرا کتابیں نکل چکی ہیں جن کی مثال نہیں مل سکتی۔ اور اس کے علاوہ بھی انگریزی میں اور مغربی زبانوں میں کام ہوا ہے۔ کوئی شخص ہم سے آنکھیں ملا کر کہہ دے کہ اسلام کا عائلی قانون ظالمانہ ہے۔ ہم اس سے پوچھیں گے کہ اس نے کیا پڑھا ہے؟ اس نے کتنی کتابیں پڑھی ہیں، کتنا وقت صرف کیا ہے۔ محمڈن لا کے مطالعہ میں؟ ہم اس کا امتحان لیں گے، ہم اس کو بغیر امتحان لئے نہ چھوڑیں گے۔ ہم پوچھیں گے کہ تم طلاق کو جانتے ہو؟ تم ترکہ کے متعلق کتنا جانتے ہو؟ اس لئے کہ اب وہ زمانہ نہیں رہا۔ کہ جو چاہا وہ منہ سے نکال دیا۔ یہ پریس کا زمانہ ہے، یہ ابلاغ عامہ کے ذرائع کا زمانہ ہے۔ دنیا میں کوئی آدمی کہیں الگ تھلگ نہیں رہتا۔ ساری دنیا گھر کا آنگن بنی ہوئی ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ یورپ میں کیا ہو رہا ہے۔ امریکہ میں کیا ہو رہا ہے۔ اب علماء بھی ایسے نہیں رہے کہ آپ ان سے کہئے کہ آپ جانتے نہیں زمانہ کدھر جا رہا ہے۔ آج علماء بیسیوں جدید تعلیم یافتہ حضرات سے زیادہ جانتے ہیں کہ زمانہ کدھر جا رہا ہے۔ معترضین آئیں ہم سے باتیں کریں۔ اپنا عائلی قانون سامنے رکھیں۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا۔ کہ آپ جس سے چاہیں کہہ دیں کہ آپ جانتے نہیں ہیں۔ اگر کوئی کہے گا تو ہم اس کا امتحان لیں گے۔ کہ آپ کو کہنے کا حق ہے کہ نہیں، آپ (QUALIFIDE) ہیں کہ نہیں، اس کے بعد پھر ہم آپ کی بات توجہ سے سنیں گے۔

تو بھائیو! ہم قانون سے شرمندہ نہیں۔ ہم یہاں نہیں بلکہ واشنگٹن میں، پیرس میں، لندن میں، نیویارک میں آپ کہیں سیمینار منعقد کریں۔ ۱۹۵۱ء میں پیرس میں وہاں کی جامعات (یونیورسٹیز) اور فضلاء و ماہرین قانون کے زیر اہتمام فقہ اسلامی کا ہفتہ منایا گیا۔ اس میں مشرق وسطیٰ کے فاضل ترین علماء، و ماہرین قانون اور پروفیسر صاحبان بھی مدعو کئے گئے۔ وہاں کے بڑے بڑے جیورسٹ، بڑے بڑے قانون دانوں نے اور اعلیٰ درجہ کے پروفیسروں نے برملا کہا کہ اسلامی فقہ ہمارے قانون سے زندگی کے بہت سے شعبوں میں ابھی بہت آگے ہے۔ انہوں نے کہا کہ فلاں چیز میں حنفی قانون تک ابھی ہم نہیں پہنچے۔ اور فلاں شعبہ میں حنبلی فقہ کو ہم نہیں پہنچے۔ معاملات میں، بیوع میں، ملکیت کے بارے میں، شہادت کے مسائل میں فلاں فقہ تک نہیں پہنچ سکے۔

حضرات! اسی لہجہ میں اور اسی خود اعتمادی کے ساتھ ہم اپنے غیر مسلم بھائیوں سے بات کریں گے۔ لیکن ہم آپ سے دوسرے لہجہ میں بات کریں گے۔ آپ ہمارے بھائی ہیں، آپ کا ہم پر حق ہے۔ ہمارا آپ پر حق ہے۔ آج آپ نے ہمارے پیچھے نماز پڑھی ہے۔ تو آپ ہماری بات بھی سنئے، اور غور کیجئے۔ کہ آپ اپنے گھروں میں، اپنی عائلی زندگی میں اس قانون پر کتنا عمل کرتے ہیں۔ آپ اس قانون کو توڑیں اور دوسروں سے کہیں کہ وہ جوڑیں۔ یہ انصاف کی بات نہیں۔ ان سے ہم نہیں کہیں گے کہ ہمارے مسلمان توڑتے ہیں، یہ ہم آپ سے کہیں گے، حقیقت حقیقت ہے صداقت صداقت ہے، ضرورت ضرورت ہے۔

میرے بھائیو! آپ مجھے معاف کریں، میرے آپ کے صوبہ سے بہت قریبی تعلقات ہیں میرے بزرگوں نے آپ کے خطہ کا دورہ کیا ہے۔ یہاں انھوں نے اپنا پسینہ بہایا ہے۔ یہ وہ کلکتہ شہر ہے جب حضرت سید احمد شہیدؒ کا قافلہ یہاں آیا[1] تو یہاں کے شراب کے ٹھیکیداروں نے سرکار انگریزی کو جس کا کلکتہ کیپیٹل اور سیاسی مرکز تھا درخواستیں گذاریں کہ جب سے یہ قافلہ یہاں آیا ہے اس وقت سے ایک آدمی بھی بھول کر ہمارے شراب خانوں میں نہیں آیا۔ ہم ٹیکس نہیں ادا کر سکتے۔

حکومت نے اس سلسلہ میں تحقیقات کی معلوم ہوا کہ واقعی جب سے شمالی ہند کی طرف سے یہ قافلہ آیا ہے اس وقت سے لوگوں نے شراب چھوڑ دی ہے۔ ہزاروں لاکھوں آدمیوں نے توبہ کر لی ہے۔ اور ان شراب خانوں کی بکری بند ہو گئی ہے۔ تو کہا گیا کہ اچھا اس وقت ادا نہ کرو۔ لیکن قافلہ کے جانے کے بعد ہم پھر دیکھیں گے کہ اگر اس کے بعد بھی مسلمان شراب نہیں لیتے، نہیں پیتے تو ہم معاف کر دیں گے ورنہ تمہیں دینا پڑے گا۔

سید صاحب اور ان کے ہمراہیوں کو معلوم ہوا کہ بہت سے لوگوں نے بغیر نکاح کے عورتوں کو اپنے گھروں میں بٹھا رکھا ہے تو ایک مستقل کام یہ تھا کہ نکاح پڑھائے جاتے تھے۔ اور توبہ کرائی جاتی تھی۔ اور ازدواجی تعلقات شرعی طریقہ پر قائم ہوتے تھے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ بہت سی جگہ نکاحی عورتوں کی کوئی تعداد مقرر نہیں ہے۔ جس کے دل میں جتنا آتا ہے عورتوں کو اپنے گھروں میں ڈال لیتا ہے۔ شرعی پردہ کا رواج بھی بہت کم ہے۔ یہ کمزوریاں مختلف علاقوں میں تھیں۔ ہمارے مصلحین شریعت کے نمائندے اس کے خلاف صف آرا ہوئے اور کوششیں کیں[2]۔

آج پھر ہم مسلم پرسنل لا بورڈ کے ذریعہ اس بات کا مطالبہ کریں گے کہ تمام غیر شرعی رسوم، جاہلیت کی تمام رسمیں اور خاص طور پر یہ کہ ہم نے بجائے اپنے برادران وطن کو اسلام کی نعمت اور اس کا تحفہ دینے کے
ہم نے ان کی جو کمزوریاں ان سے لی ہیں ان
کمزوریوں کو واپس کریں ان سے کہیں کہ پہلے اپنے گھر کی خبر لیجئے۔ آپ کے یہاں بیوائیں کس حال میں زندگی گزار رہی ہیں۔ آپ کے یہاں نکاح ثانی نہیں ہے۔ آپ کے یہاں ترکہ نہیں ہے۔ آپ کے یہاں عورت کو ملکیت کے حقوق

باقی صہ پر

---

[1] ۱۲۳۶ھ ۱۸۲۱ء کا واقعہ ہے قافلہ میں جو دریائے گنگا کے راستہ سے درمیانی شہروں اور قصبات میں تبلیغ و دعوت کا کام کرتا ہوا، تین مہینے سے زائد مدت میں کلکتہ پہنچا تھا۔ سات سو کے قریب آدمی تھے۔ جو کلکتہ سے حج کے لئے روانہ ہونے آئے تھے۔ تین مہینے اس مبارک قافلہ کا قیام کلکتہ میں رہا۔

[2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "سیرت سید احمد شہید" جلد اول صہ ۳۱۵ تا ۳۲۰۔

بیاد مجلسِ شیخ الحدیث

افادات شیخ الحدیث مولانا عبدالحق مدظلہٗ

ضبط و ترتیب ـــــ: ـــــ مولانا عبدالقیوم حقانی

صحبتے با اہلِ حق

صوبہ سرحد میں صحابہ کرامؓ کا ورودِ مسعود | ۲ مئی ۱۹۸۵ء ۔ حسب معمول بعد العصر حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کی مجلس فیض و برکت میں حاضری دی تو ایک سلسلہ گفتگو میں ارشاد فرمایا کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ جس جس علاقے میں گئے ہیں وہاں علومِ نبوت کی اشاعت ہوئی ہے اور سنی مسلمانوں کی اکثریت بھی اس علاقہ میں زیادہ ہے جہاں حضراتِ صحابہ کا ورودِ مسعود ہوا ہے ۔

ایک صحابیؓ کا گزر بھی اگر کسی علاقے میں ہوا ہے ۔ تو وہ اس علاقہ پر خیر و برکات کے نزول کا باعث ہے ۔ کابل حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں فتح ہوا ۔ صلوٰۃ الخوف (احناف کے مسلک کے موافق) کابل میں پڑھی گئی یہ صحابہؓ ہی کے برکات ہیں کہ آج کابل کے لوگ مسلمان ہیں اور اپنے دین میں پختہ ہیں یہ کابل پہلے دہلی کے ماتحت تھا ۔ چونکہ اس علاقہ میں صحابہؓ تشریف لائے ہیں ہمارے صوبہ سرحد میں بھی بنوں کوہاٹ میں صحابہؓ کی تشریف آوری کا ذکر تاریخ میں ملتا ہے یہ سب ان ہی کے برکات ہیں کہ یہاں اکثریت اہلِ اسلام کی ہے ۔

دارالعلوم دیوبند میں اوّلین حاضری | ۴ مئی ۱۹۸۵ء ۔ حسب معمول بعد العصر مجلس شیخ الحدیث میں حاضری دی دارالعلوم کے اساتذہ میں مولانا عبدالحلیم دیروی اور مہمانوں کے علاوہ دورۂ حدیث کے منتہی طلبہ بھی موجود تھے ۔ قاری محمد عبداللہ ڈیروی نے دریافت کیا :

حضرت ! آپ جب دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے تھے تو اس وقت علامہ انور شاہ کشمیری دیوبند ہی تھے یا ڈابھیل تشریف لے جا چکے تھے ۔ ؟

حضرت شیخ الحدیث مدظلہٗ نے ارشاد فرمایا :

اوّلاً جب میں دارالعلوم دیوبند حاضر ہوا تو یہ وہ زمانہ تھا جب سواتی اور بنگالی طلبہ میں جھگڑا ہوا تھا ۔ نائب مہتمم محمد احمد صاحب تھے پٹھان طلبہ میں داخلہ کے سلسلہ میں قدرے سختی کی جارہی تھی ۔ اور واقعتہً اس وقت ایسا کرنا ضروری بھی تھا ۔

میرے لئے بھی داخلہ مشکل ہوگیا تھا تو میں اپنے استاد مولانا مشتاق حسن صاحب کے ہاں گلوٹی حاضر خدمت

ہوا۔ وہ گلوٹی سے کلکتہ روانہ ہوئے تو میں نے بھی ان کی رفاقت و خدمت کو سعادت سمجھا اور مدرسہ عالیہ کلکتہ میں ان کے ساتھ رہ کر ان سے فنون کی تحصیل کی، اس سال حضرت العلامہ مولانا انور شاہ کشمیریؒ دارالعلوم دیوبند سے تشریف لے جاچکے تھے۔ تاہم ان کا قلب دارالعلوم دیوبند سے بندھا رہا۔ کچھ عرصہ وہاں تدریس کی، واپس دیوبند تشریف لائے اور یہیں ان کی وفات ہوئی۔

علامہ شبیر احمد عثمانی اور فوائد عثمانیہ | قاری محمد عبداللہ صاحب کے دریافت کرنے پر ارشاد فرمایا:

تقسیم سے قبل دارالعلوم دیوبند میں زمانۂ تدریس کے قیام کے دوران میں علامہ شبیر احمد عثمانی سے ملاقاتیں اور مجالس ہوا کرتی تھیں، مختلف، علمی و سیاسی موضوعات پر موصوف سے گفتگو رہتی، ایک روز دورانِ گفتگو میں نے دریافت کیا۔

حضرت! آپ کی تصانیف میں سب ایک سے ایک بڑھ کر ہیں، فتح الملہم شرح صحیح مسلم جیسی علمی اور بلند پایہ کتابیں آپ نے تصنیف فرمائی ہیں۔ ادھر حضرت شیخ الہند کے ترجمہ و تفسیر قرآن کی تکمیل "فوائد عثمانیہ" کے نام سے کی ہے۔ ان میں زیادہ محنت، تعب اور مشکل اور وقت کس تصنیف میں آپ کو پیش آئی تو انہوں نے بڑی شفقت سے فرمایا: "تصنیف اور تالیف کے میدان میں خدا کا فضل شاملِ حال رہا جس موضوع پر لکھنا چاہا اللہ کی مدد نے یاوری کی البتہ حضرت شیخ الہند کے ترجمہ و فوائد کی تکمیل میں بڑے حزم احتیاط اور صبر آزما مراحل سے گزرنا پڑا ایک ایک جملہ اور لفظ لفظ پر غور و فکر، محنت و مطالعہ، اور بڑے حزم و احتیاط اور سوچ بچار کرنا پڑا اور یہ خالص خدا کے فضل اور اس کے احسان سے پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

شیخ مدنی سے تعلق | قاری صاحب موصوف نے جب محمد علی جناح سے تعلق یا ملاقات کے بارے میں دریافت کیا تو حضرت شیخ الحدیث مدظلہ نے فرمایا کہ محمد علی جناح سے میرا کوئی تعلق نہیں رہا۔ اور نہ ان سے کبھی ملاقات ہوئی۔ الحمدللہ الحمدللہ شیخ العرب والعجم مولانا حسین احمد مدنیؒ سے جب سے تعلق قائم ہوا۔ تب سے کسی دوسری جانب نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا تذکرہ | مولانا ابوالکلام آزاد کا تذکرہ چھڑا تو ارشاد فرمایا:

ایک مرتبہ مولانا ابوالکلام آزاد لاہور تشریف لائے تھے، ایک بہت بڑا جلسہ ہوا، یہ زمانہ بھی وہی تھا کہ بیگانے تو کیا اپنے بھی مولانا ابوالکلام آزاد کو اپنی تنقید و تردید کا نشانہ بنائے ہوئے تھے۔ مجھے بھی اس موقعہ پر حاضری کی سعادت نصیب ہوئی۔ مولانا آزاد کی تقریر تھی۔ تقریر کیا تھی، عقل و شعور اور جذبات کا آمیزہ تھا، دلائل براہین آزاد کی خطابت میں ڈھل کر سامعین کے دل و دماغ کو مسحور کر رہے تھے۔ کہ لوگوں نے ابوالکلام آزاد زندہ باد کے فلک شگاف نعرے شروع کر دیئے۔ تو مولانا آزاد نے فرمایا: مسلمانو! یہ وقت نعروں کا نہیں

کام کرنے کا ہے۔ اب بھی وقت ہے سنبھل جاؤ اور کام کرلو۔ بجائے جوش کے ہوش سے کام لو، اب تو میرا پیغام صرف یہی رہ گیا ہے کہ مسلمان بیدار ہوں اور نعرہ بازی کی بجائے کام کریں —— مگر حیرت ہے کہ جب میں یہی بات کہتا ہوں تو مسلمان بجائے اس کے کہ کچھ کام کرلیں الٹا میرے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔

مولانا آزاد اور مولانا حفظ الرحمٰن کی خطابت | قاری صاحب موصوف نے مولانا آزاد، شیخ مدنی، مولانا حفظ الرحمٰن، مفتی کفایت اللہ اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقاریر اور کردار کے بارے حضرت شیخ الحدیث مدظلہ سے بات چھیڑی تو ارشاد فرمایا:

اللہ! وہ کیسے اور کتنے عجیب لوگ تھے کردار اور عمل کے پکے، بات کے سچے، منافقت اور مداہنت سے کوسوں دور۔ اس لئے جو بات کرتے تھے دل میں اتر جاتی تھی۔

مولانا آزاد کی تقاریر عقل وشعور اور جذبات کی آمیزش سے تیار ہوتی تھیں، شستہ گفتگو، ادبی طرز ادا اور پھر خود مولانا آزاد کی خطابت سے اس میں جادو بھر جاتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ دشمن کے سروں پہ فولادی ہتھیار سے حملہ کر رہے ہیں۔ ایک ایک حرف شجاعت وصداقت کا آئینہ دار تھا۔ مولانا حفظ الرحمٰنؒ مولانا آزاد کے نقش قدم پر تھے ان کا انداز نرالا تھا۔ سامعین اور حاضرین کے دل مٹھی میں لے لیتے تھے۔ ان جیسی سحر بیانی کسی دوسرے میں دیکھنے میں نہیں آئی۔

مولانا احمد سعید بلبل ہند تھے۔ مولانا حفظ الرحمٰن کا اپنا مقام بہت بڑا تھا۔ مگر مولانا احمد سعید لسان جمعیۃ تھے وہ دہلی کی جامع مسجد میں جب خطاب کرتے تو ہزاروں کے مجمع پر سناٹا چھا جاتا۔ پوری کائنات ہمہ تن گوش ہوتی۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ | سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ تو ہندوستان کے سب سے بڑے خطیب تھے، وہ تو جامع الکمالات تھے۔ ان کی تقریر میں سب سے زیادہ محبوب چیز قرآن کی تلاوت تھی محسوس ہوتا گویا اب قرآن نازل ہو رہا ہے۔ سننے والے محظوظ ہوتے اور وجد محسوس کرتے۔ دارالعلوم حقانیہ کے سالانہ جلسوں میں بھی تشریف لاتے رہے۔ مگر بدقسمتی سے اس زمانہ میں ٹیپ ریکارڈر کا شیوع نہیں ہوا تھا۔ اس لئے محفوظ نہیں کی جاسکیں۔ دارالعلوم حقانیہ کے سالانہ جلسہ میں ایک مرتبہ تقریر فرما رہے تھے کہ بجلی فیل ہوگئی یا بند کردی گئی۔ کارکن اس کے بنانے میں لگے کہ حضرت شاہ صاحب نے مسکرا کر فرمایا: بھائی! بجلی بنانا چھوڑ دو اور ٹھک ٹھک بند کردو۔ عطاء اللہ شاہ نے جس بات کے بیان کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے، وہ بیان کرکے رہے گا۔ کارکن آرام سے بیٹھ گئے حضرت شاہ صاحب کی تقریر جاری تھی کہ صبح کی اذان ہوگئی۔ بغیر لاؤڈ سپیکر کے شاہ جی کی یہ تقریر رات بھر چھ گھنٹے جاری رہی، کیا مجال کہ کسی نے کروٹ لی ہو۔

حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب | حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب بہت کم بولتے تھے اور جب بولتے تو ان کی ایک ایک بات وزنی اور کافی ہوا کرتی تھی، شیخ العرب والعجم حضرت مدنیؒ کے سامنے کسی کو بھی بات کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی مگر مجھے حیرت ہوتی کہ اہم اور مشکل مسائل کے وقت حضرت مدنیؒ مفتی کفایت اللہ صاحب کو بلاتے ان سے مشورہ لیتے اور ان کی رائے کو صائب قرار دیتے، یہ خصوصیت صرف حضرت مفتی صاحب کو حاصل تھی، مراد آباد کے ایک اجلاس میں جب گڑبڑ ہوئی تو حضرت مدنیؒ نے مفتی کفایت اللہ صاحب کو بلایا وہ تشریف لائے۔ صورتِ حال سے واقفیت کے بعد انہوں نے جو تجاویز پیش کیں وہ سب نے قبول کر لیں۔ درحقیقت حضرت مفتی صاحبؒ جمعیۃ علماء ہند کے روحِ رواں تھے۔

شیخ العرب والعجم مولانا حسین احمد مدنیؒ | شیخ العرب والعجم مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی شان سب سے نرالی تھی، علماء بہت دیکھے، مدرسین کے درس میں شریک ہوئے، ہندوستان کی قیادت کو پرکھا مگر جو جوہر اور امتیازی صفات شیخ مدنیؒ میں دیکھے وہ کہیں دوسری جگہ نظر نہیں آئے۔ شیخ مدنیؒ کا تقویٰ، شجاعت، شرافت، تواضع، انکساری اور کسرِ نفسی ان کے لئے طبیعتِ ثانیہ بن چکی تھی — جب حضرت مدنیؒ کا نام سنا تھا اور دیکھا نہیں تھا تو نام کی شہرت سے ان کی شخصی عظمت کا ایک نقشہ ذہن میں بن چکا تھا۔ خیال تھا کہ شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ اور امیرانہ رکھ رکھاؤ کے آدمی ہوں گے۔ مگر جب ان کی مجلس دیکھی، ان کی معاشرت دیکھی تو انہیں کچھ اور پایا۔ ان کا علم بھی بے مثال تھا اور حلم بھی بے مثال۔

دوسری درسگاہوں میں منطق اور فلسفہ کی بڑی کتابیں پڑھ کر جب شیخ مدنیؒ کی درسگاہ میں حاضری دی تو ان کی درسگاہ میں سب سے بڑی خصوصیت یہ پائی کہ خود کو پہچان لیا، خود شناسی کا احساس ہوا اور علم اور علماء کی شان سامنے آئی — جب مجھے دارالعلوم دیوبند میں تدریس کا موقعہ ملا تو اس زمانہ میں بھی شیخ مدنیؒ کا درسِ حدیث ہوا کرتا تھا۔ میں نے اپنے زمانۂ تدریس میں بھی شیخ مدنیؒ کے درس میں شرکت کی کوشش کی تدریس کے اوقات کے علاوہ ۱۲ بجے کے بعد، بعد العصر، بعد العشاء کے درسوں میں شریک ہوا کرتا تھا، شیخ مدنیؒ کا درس علمی اور مدلل ہونے کے ساتھ ساتھ آسان اور سہل ہوا کرتا تھا۔

ایک مرتبہ ۱۵ روز تک مسلسل حضرت مدنیؒ سفر پر رہے۔ جب واپسی ہوئی تو سب کو یقین تھا کہ حضرت تھکے ہوئے ہیں اور مطالعہ بھی نہیں کیا، سبق نہیں ہوگا۔ مگر آپ گاڑی سے اترے اور سیدھے دارالحدیث میں پہنچے اور سبق پڑھانا شروع کر دیا۔ نواقضاتِ وضو کا بیان تھا۔ ارشاد فرما رہے تھے کہ مسئلہ زیرِ بحث میں آٹھ مذاہب مشہور ہیں، پھر مذاہب، ان کے دلائل اور تفصیل سے بحث کی، طلبہ متحیّر کہ تھکے ماندے ہونے کے باوجود اس قدر علمی تبحّر وسعتِ مطالعہ اور قوتِ حافظہ یہ تو بس ان ہی کی کرامت تھی — ایک مرتبہ درس کے دوران ایک طالبعلم

نے کسی مسئلہ میں شمس بازغہ کی بحث چھیڑنا چاہی تو شیخ مدنیؒ نے متعلقہ مسئلہ میں عبارات پڑھ پڑھ کر بحث کا مکمل احاطہ کیا۔ اور فرمایا: بھائی! میں نے جب شمس بازغہ پڑھی تھی اس زمانہ میں کل نمبر پچاس ہوا کرتے تھے۔ اور مجھے امتحان میں ۶۳ نمبر حاصل ہوئے تھے۔

بہرحال اپنے اساتذہ میں شیخ مدنیؒ اور اکابر ہند میں شیخ مدنیؒ سے جو قلبی عقیدت اور وارفتگی اور غیر اختیاری تعلق رہا۔ وہ کسی دوسرے سے پیدا نہ ہو سکا۔ ؎

؎ حضرت تھانویؒ نے بھی کسی جگہ یہ لکھا ہے کہ علمی و اخلاقی اور روحانی تربیت کیلئے مشائخ و اساتذہ میں کسی ایک کو منتخب کرنا پڑتا ہے۔ گو عظمت و احترام سب کا لازمی ہے۔ الاب واحد ولا عمام شتیٰ۔ اور اس موقعہ پر حضرت تھانویؒ اکثر یہ شعر بھی سنایا کرتے تھے ؎

ہمہ شہر پُر ز خوباں منم و خیال ماہے
چہ کنم کہ چشم بدخو نہ کند بکس نگاہے

ہمارے حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کا مندرجہ بالا ارشاد اور اپنے شیخ حضرت مدنیؒ سے عقیدت و محبت بھی اسی حقیقت کی آئینہ دار ہے۔ (عبدالقیوم حقانی)

حاصل نہیں ہیں۔ اور آپ ہم سے کہتے ہیں کہ تمہارا قانون ظالمانہ ہے تم اپنے قانون کی اصلاح کرو۔

حضرات! میری تقریر بہت لمبی ہو گئی ہے لیکن میں آپ کو داد اور شاباشی دیتا ہوں کہ آج پہلی مرتبہ میں نے یہ دیکھا کہ نماز کے بعد مجمع پھر آگیا اور اسی طریقہ سے بیٹھا۔ یہ ایک تاریخی ریکارڈ ہے۔ میں آپ کی بنگال کے مسلمانوں کی تعریف کرتا ہوں کہ آپ پھر نماز پڑھ کے ایسے آگئے جیسے آپ گئے ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس جذبہ کو اور آپ کے اس دین کے شوق کو قائم رکھے۔ لیکن مبارک ہو گا یہ جلسہ، تاریخ ساز ہو گا یہ جلسہ اور ساری محنتیں وصول ہیں آنے والوں کی، بلانے والوں کی۔ اور خرچ کرنے والوں کی۔ اگر آپ یہ طے کر لیں کہ خلاف شرع رسمیں اب ہمارے گھر میں نہیں رہیں گی اور ہم شریعت کے قوانین پر چلیں گے تو پھر دیکھئے گا کہ آسمان سے برکتیں نازل ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ دلوں میں انقلاب پیدا کر دیں گے۔ آپ کے قانون میں مداخلت کی کوئی آواز نہیں اٹھے گی۔ لیکن جب تک کمزوری خود ہمارے یہاں ہے آواز اٹھتی رہے گی۔ اس آواز کے اٹھنے کا جواز نہیں۔ میں صاف کہتا ہوں، ہم اگر کچھ بھی کریں جب بھی کسی جمہوری ملک میں اس کا جواز نہیں جیسی صاف بنیادی اور مذہبی حقوق پر دست درازی کی جائے۔ لیکن آپ کو خود اپنی اصلاح پہلے کرنی چاہئے۔ اصلاح گھر سے شروع ہوتی ہے۔ میں ان الفاظ پر اپنی تقریر ختم کرتا ہوں۔

محکمہ مواصلات و تعمیرات
صوبہ سرحد

نوٹس برائے پیشگی اہلیت ٹھیکیداران

محکمہ مواصلات و تعمیرات / دیگر محکمہ جات کے اے کلاس منظور شدہ ٹھیکیداروں / فرموں سے مندرجہ ذیل کام کیلئے پیشگی اہلیت کی بنیاد پر درخواستیں مطلوب ہیں۔

نمبر شمار	کام کا نام	تخمینہ لاگت	زر ضمانت	میعاد تکمیل
۱۔	امپرومنٹ اینڈ وائیڈننگ پشاور کوہاٹ روڈ۔ کلومیٹر ۶ تا کلومیٹر ۳۱	۱۸۰،۸۰۰ ملین	۳،۷۶ ملین	۳۶ ماہ

درخواستیں برائے پیشگی اہلیت ٹھیکیداران دفتر زیر دستخطی کو مورخہ ۰۵-۱۱-۱۹ تک پہنچ جانی چاہئیں خواہشمند ٹھیکیداروں اور فرموں کو مندرجہ ذیل اعداد و شمار معلومات فراہم کرنے ہوں گے۔

۱۔ فرم / ٹھیکیدار کا نام اور پورا پتہ۔ (ب) بحیثیت منظور شدہ ٹھیکیدار / فرم کا موجودہ اندراج (i) محکمہ مواصلات و تعمیرات میں۔ (ii) دیگر محکموں اور تنظیموں میں۔
(iii) گذشتہ پانچ سالوں کے دوران بڑے منصوبوں کی تعمیر کا تجربہ منصوبوں پر لاگت اور تکمیل کی مدت کے بارے میں تفصیل۔ (iv) موجودہ زیر تعمیر کاموں کی تفصیل۔ (v) قابل استعمال مشینری جو کہ فرم کی اپنی ملکیت ہو کی فہرست۔ (vi) ٹھیکیدار فرم کے ساتھ موجودہ وقت میں باقاعدہ تنخواہ پر کام کرنے والے اہم اہل کاروں کے نام اور ان کی اہلیت۔ (vii) کیا ٹھیکیدار / فرم کسی ثالثی یا تنازعے یا سول مقدمے میں ملوث ہے اور بنک کی طرف سے زیر دستخطی کے نام سربمہر لفافے میں ٹھیکیدار / فرم کی مالی حالت اور بنک بیلنس کا سرٹیفکیٹ

۲۔ جو ٹھیکیدار / فرم محکمہ مواصلات و تعمیرات میں رجسٹرڈ نہ ہوں انہیں پری کوالیفائڈ ہونے کی صورت میں مبلغ ۷۵۰۰/- روپے نقد ناقابل واپسی پری کوالیفیکیشن فیس ادا کرنا ہو گی۔

۳۔ مزید معلومات دفتر ہذا سے کسی بھی یوم کار دفتری اوقات میں حاصل کی جا سکتی ہیں۔

ایگزیکٹو انجینئر ہائی وے ڈویژن پشاور
فون ۷۶۰۶۳

INF (P) 3013

خالد شیلڈرک
ترجمہ و تلخیص۔ افسر حسن صدیقی

میں مسلمان کیوں ہوا؟

اسلام اپنے دینِ فطرت ہونے، طرزِ معاشرت کی سادگی اور اپنے غیر طبقاتی عادلانہ نظام کی وجہ سے دیگر مذاہبِ عالم کے پیروکاروں کے لئے ہمیشہ سے کشش انگیز اور جاذبِ توجہ رہا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بہت سے لوگ معاشرہ و ماحول اور اپنے خاندان کی طرف سے عائد کردہ پابندیوں کے تحت قبولِ اسلام کی جراتِ رندانہ کرگزرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ لیکن وہ لوگ جو حقیقت کے متلاشی رہتے ہیں اور وہ اپنے شعور و ضمیر کو بیدار رکھنا چاہتے ہیں انہیں یہ پابندیاں اظہارِ حقیقت سے نہیں روک سکتیں۔ ایسا ہی ایک جیالا برطانیہ کا خالد شیلڈرک ہی ہے اس کی کہانی خود اس کی زبانی کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔

میں برطانیہ میں پیدا ہوا اور میری پرورش چرچ آف انگلینڈ کے اصول و قوانین کے تحت ہوئی۔ میرا معلم ایک عیسائی پادری تھا جس کی میں آج بھی عزت کرتا ہوں۔ وہ وعدہ کا پکا اور میری کوتاہیاں معاف کرنے میں بڑا وسیع القلب تھا۔ مجھے اقرار ہے کہ میرے بچپن کے زمانہ میں مذہب نے مجھے نسبتاً کم پریشان کیا۔ میں چرچ کی عبادتوں اور دعاؤں میں عادتاً شریک ہوتا تھا۔ لیکن جوں جوں میرا شعور پختہ ہوتا گیا۔ اور میں نے اپنے گرد و پیش کے ماحول پر نظر ڈالی تو معاملات نے دعوتِ فکر دینی شروع کر دی۔

میں بنیادی طور پر رومن کیتھولک تھا اور عیسائیت کے دوسرے فرقوں اور دوسرے مذاہب کے متعلق کچھ نہ جانتا تھا۔ لیکن جب عیسائی فرقوں کے افراد نے میرے فرقہ کے بارے میں مجھ سے بحثیں شروع کر دیں تو مجھے اپنی معلومات میں اضافہ اور مطالعہ کو وسیع کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ ویسے یہ بات تو پہلے ہی سے مجھے پریشان کر رہی تھی کہ میرے فرقہ پر حرف گیری کیوں کی جا رہی ہے۔ جوں جوں میرے مطالعہ میں اضافہ ہوا مجھ پر واضح ہوتا گیا کہ میں ہر چند کہ عیسائی ہوں لیکن عیسائیت کی بہت سی باتوں پر یقین نہیں رکھتا اور نہ ہی عمل کرتا ہوں۔ میں عیسائیت کے کئی مختلف گرجوں میں لیکچر سننے اور مطالعہ کی غرض سے گیا تاکہ حقیقت مجھ پر آشکارا ہو لیکن دل کو تسکین نہ ہوئی۔ البتہ لیکچر سننے اور مطالعہ کے بعد صرف ایک فرقہ نے مجھے متاثر کیا۔ اور وہ تھا چرچ وحدانیت ——— حالاں کہ اس سے قبل میں تثلیث ——— کے عقیدہ

سے متاثر تھا۔ اور وہ بھی اس حد تک کہ عیسائی مذہب میں شاید یہی فرقہ سچا ہے اور باقی فرقے اتنے متاثر کن نہیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تک دیگر عقائد کے خلاف میری آنکھوں پر ایک دبیز موٹی عینک چڑھی ہوئی تھی۔ بہرحال میرے دماغ میں ایک انتشار برپا تھا۔ اور میں مستقل سوچ میں غرق رہنے لگا۔

بالآخر میں نے محسوس کیا کہ میرے دل نے جس مذہب کو ترتیب دیا ہے یا بنایا ہے وہ عیسائی گرجوں کی اسلیت سے دور ایک الگ تھلگ کوئی اور ہی چیز ہے۔ سب سے پہلے جس عیسائی عقیدہ کے خلاف میرے دل میں صدائے احتجاج بلند ہوئی وہ یہ تھا کہ میری پیدائش میرے باپ اور ماں کے گناہ کی وجہ سے واقع ہوئی۔ بھلا میں کیسے مان لیتا کہ میرے پیارے ماں باپ گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں۔ یہ عقیدہ تو ہر فرماں بردار بیٹے کو تسلیم کرنے پر مجبور کرتا ہے کہ اس کے ماں باپ نے اسے دنیا میں لاکر ایک گناہ کیا ہے۔ اور یہ کہ وہ اس دنیا میں ایک گناہ گار فطرت لے کر پیدا ہوا ہے۔ اور گناہ کرنا اس کی سرشت میں داخل ہے۔ اس سے میرا دماغ گھوم گیا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کہ میرا گناہ سے بچنا محال ہے۔ اور یہ کہ خدا کو منظور ہی یہ ہے کہ میں گناہ کروں کیونکہ یہ میری فطرت میں داخل ہے اللہ معاف کرے یہ تو خدا کے ساتھ بڑا شرمناک مذاق اور اس کی تضحیک ہے۔ یہ بہت بڑا اتہام ہے۔ پھر عیسائیت کے مطابق اس گناہگار کی منزل جہنم ہے جہاں ابلتے ہوئے چولہے اور پانی کی جھیلیں ہیں۔ اور اس سے بچنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ عیسائی بچہ کا اس دنیا میں آنے کے بعد اس کے ماں باپ کے گناہوں سے نجات دلانے کے لئے اور اسے پاک کرنے کے لئے اس کا بپتسمہ —————— کر دیا جائے اس کے لئے ماں باپ کو بچہ گرجا میں پہنچانا پڑتا ہے۔ جہاں پادری شراب کے چھینٹے بچہ پر ڈالتا ہے۔ اور کچھ پڑھ کر اس کو پاک قرار دیتا ہے۔ اس کے برخلاف جب میں نے اسلامی لٹریچر پڑھا تو معلوم ہوا کہ اس مذہب میں بالکل دوسرا تصور ہے۔ یعنی ہر بچہ معصوم پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ اسلام کی طرف ہی مائل ہوتا ہے۔ جو ایک فطری مذہب ہے۔ حقیقت میں تو یہ والدین ہیں جو بچہ کو عیسائی، یہودی یا مسلمان بنا دیتے ہیں۔ پیغمبر اسلام کی اس حدیث سے عیسائی نظریہ کی واضح نفی ہوتی ہے۔

عیسائی لٹریچر کے بغور مطالعہ کے بعد مجھ پر یہ راز بھی کھلا کہ بائبل کے مختلف مراحل میں خالق کائنات کا جو تصور دیا گیا ہے وہ ایک شفیق و مہربان خالق کا نہیں ہے بلکہ (نعوذ باللہ) ایک ایسے انسان کش خالق کا ہے جو ایک چھوٹی سی مخلوق یعنی انسانی فرقہ کی خوشنودی کے لئے دوسری مخلوق کی تباہی و بربادی چاہتا ہے مجھے باور کرایا گیا ہے کہ خالق نے اس کرہ کی مخلوق کو وجود میں لانے کے بعد اس طرح سے نظام درہم برہم کر دیا کہ وہ سوائے یہودیوں کے دیگر اقوام کی تباہی چاہتا ہے۔ اس نے یہ غیر متبرک حکم اس طرح دیا کہ جہاں کہیں تم غیر یہودی کو پاؤ اسے نہ چھوڑو بلکہ قتل کر دو۔ کیا میں اس پر یقین کر سکتا تھا۔ ہرگز نہیں۔ اور یہ کہ خالق ان کو معاف کرتا ہے جو ان باتوں پر یقین رکھتے ہیں اور یہ کہ اس نے اس دنیا میں بے شمار پیغمبر بھیجے لیکن انسان نے خالق کی تعلیمات نہ مانیں جس

کی وجہ سے جہنم کے مستحق ٹھہرے۔ لیکن ایک استثنار کے ساتھ وہ یہ کہ انسانی گناہوں کے کفارہ کے طور پر صرف خدا کے بیٹے (مراد حضرت عیسیٰؑ) کی قربانی ہو جس سے عقیدت مندوں کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے .... کیا عجیب بات ہے۔

خالد شیلڈرک کہتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ میں یقین کروں کہ خدا نے انسان کے گناہوں کے کفارہ اور اپنے غصہ اور انا کی تسکین کے لئے اپنے ہی بیٹے کو قتل کرایا تاکہ وہ خود ہی قربانی قبول کرے۔ عجیب باپ ہے اور عجیب ان کی انا و تسکین ہے۔ میں ان سب واہیات باتوں پر یقین نہیں کر سکتا۔ اور عیسائی رہنے کے لئے کہ یہ عیسائی عقیدہ کی بنیاد ہیں۔

شیلڈرک خالد اسی پر اکتفا نہیں کرتے وہ بائبل پر بھی تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے کہتے ہیں۔

پھر میں نے یہ بھی دیکھا کہ موجودہ بائبل کسی صورت میں مصدقہ نہیں ہے کیونکہ جو نام بائبل میں دیئے گئے ہیں ان کی کوئی تصدیق و سند نہیں ہے۔ اور نام والوں نے خود بھی تسلیم کیا ہے کہ پہلی پانچوں کتابیں حضرت موسیٰؑ کی نوشتہ نہیں ہیں اور یہ کہ بادشاہ و امراء ________ رُتھ (RUTH) عیسایہ (ISIAH) ملاچی (MALACHI) وغیرہ نامعلوم لوگوں کی تحریریں ہیں جو غالباً پیغمبروں کی کچھ تعلیمات پر مبنی ہیں۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ میتھیو (MATHEW)، مارک (MARK) اور لیوک (LUKE) نے بھی یہ تعلیمات تحریر نہیں کیں۔ کیونکہ وہ خود تسلیم کرتے ہیں کہ یہ مختلف ہیں جن لوگوں نے رائج الوقت چاروں انجیلوں کا مطالعہ کیا ہے وہ میری اس بات کی تصدیق کریں گے پھر یہ کہ سینٹ پال (SAINT PAL) سے منسوب خطوط اور تحریریں اس کی نوشتہ نہیں ہیں۔ اس طرح سے گویا تمام کتاب ایک ایسی تحریروں کا ملغوبہ ہے کہ جن کے لکھنے والوں کا پتہ نہیں ہے۔ اور حیرت ہے کہ دنیا کے سامنے اس کتاب کو متبرک بائبل کے نام سے پیش کیا جاتا ہے حد تو یہ ہے کہ سینٹ پال نے حضرت عیسیٰؑ کا زمانہ سرے سے دیکھا ہی نہیں۔ بلکہ تاریخ ان کا وجود چوتھی صدی عیسوی بتاتی ہے۔ علاوہ ازیں بائبل کو ضرورت کے مطابق وقتاً فوقتاً تبدیل کیا جاتا ہے۔ حال ہی میں "بائبل کمیٹی برائے نظرثانی" نے اول جان سورہ ۵-۷ (I. JOHN-V-7) کو بائبل سے حذف کر دیا ہے۔ وہ سورہ یہ ہے کہ جنت کے ضامن صرف تین ہیں۔ یعنی باپ، بیٹا اور متبرک اور غیر مرئی سایہ (مراد غالباً روح القدس حضرت جبریل امینؑ ہیں) اور یہ تینوں ایک ہیں۔ مقدس ہیں (HALY TRINITY) کمیٹی کے خیال میں اس کا ذکر کسی قدیم نسخہ میں نہیں ہے اور فرانسیسی ماہر مذہبیات ڈاکٹر بوکائی تسلیم کرتا ہے کہ یہ بعد میں شامل کی گئی ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ یہ مارٹن لوتھر نے شامل کی تھی۔ حالاں کہ یہ بھی غلط ہے۔ کیونکہ ہر چند مارٹن لوتھر نے مذہبیات میں کافی اصلاحات کی ہیں۔ لیکن اس نے بائبل کی تحریروں کو قطعاً نہیں چھیڑا۔ اور ان کو جیسے تھیں ویسے ہی تسلیم کیا اور رہنے دیا

اس نے یہ کوشش نہیں کی۔ کہ ان کی صداقت کو کریدتا جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اس پر مذہبی جنون طاری تھا اور کم ہمت تھا۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ مغموم اور بیمار تصورات کا حامل تھا اور ایک دفعہ جب اس کا ایک شیطانی روح سے واسطہ پڑا تو اس نے اس پر دوات کھینچ ماری تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دور میں کسی میں یہ ہمت نہ تھی کہ وہ بائبل کی حقیقت کا کھوج لگاتا اور حرف گیری کرتا۔ کیونکہ ایسا کرنا گردن زدنی کے مترادف تھا۔

حال ہی میں ڈرہم کے پادری ڈیوڈ جینکن (DAVID JENKIN) کے اس بیان سے چرچ آف انگلینڈ کے تمام بڑے بڑے پادری بے حد برہم اور پریشان ہیں کہ ایسٹر کے تہوار کا کوئی جواز نہیں ہے اس کے متعلق جو کہانی بائبل میں درج ہے کہ حضرت عیسیٰ صلیب دیئے جانے کے تیسرے دن بعد زندہ ہو گئے تھے محض انسانی دماغ کی اختراع ہے اور اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ یہ واقعہ سچا ہے۔ رہی سہی کسر برناباس کی انجیل ——— سے پہلے ہی پوری کر دی تھی۔ اس میں درج ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی صلیب پر چڑھائے جانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ بلکہ ان کا حواری یہودہ جس نے رومی سپاہیوں سے مل کر پکڑوانے کی سازش کی تھی اس کی شکل حضرت عیسیٰؑ سے مشابہ ہو گئی۔ نتیجہً سپاہیوں نے اسے ہی حضرت عیسیٰ سمجھ کر صلیب پر لٹکا دیا۔ قرآن بھی یہی کہتا ہے۔

"نہ وہ قتل کیے گئے، نہ ہی انہیں صلیب دی گئی۔ لیکن ایک شخص کو ان کا مشابہ بنا دیا گیا"

عیسائی مذہب کی چاروں انجیلوں میں سے ایک میں یہ بھی درج ہے کہ یہودہ کو اپنی غداری یعنی حضرت عیسیٰؑ کو پکڑوانے پر سخت تاسف ہوا اور حضرت عیسیٰؑ کے صلیب پر لٹکنے کے بعد اپنے گلے میں پھندا ڈال کر پھانسی لگا لی اور مر گیا۔ غرضیکہ تمام انجیلیں تضاد کا شکار ہیں۔ صرف برناباس کی انجیل کی بات کسی حد تک صحیح کے قریب معلوم ہوتی ہے۔

اگر یہ کہا جاتا ہے کہ رومی شہنشاہیت نے عیسائیت کا بڑا استحصال کیا ہے۔ لیکن عیسائیت خود تحمل و برداشت کا مذہب نہیں رہا ہے۔ جب رومی شہنشاہ کانسٹنٹائن نے عیسائی مذہب اختیار کیا۔ اور حضرت عیسیٰؑ کو صرف پیغمبر مان لیا۔ تثلیث کے قائل نہ تھے۔ لیکن تثلیث کے ماننے والوں عیسائیوں نے ان پر جو ہولناک مظالم ڈھائے ان کو سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ حالاں کہ وہ بھی عیسائی تھے اور محض دوسرے فرقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ کانسٹنٹائن ہی کے دور میں اتوار کے دن کو مقدس قرار دیا گیا۔ ہر چند کہ اس کا ذکر بائبل میں کہیں نہیں ہے اور ہفتہ (سنیچر) کو پاک دن مانا جاتا تھا۔ وجہ اس کی یہ بیان کی جاتی ہے۔ کہ کانسٹنٹائن چونکہ آریائی نسل سے تھا اور سورج بنسی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے عیسائی مذہب اس شرط پر اختیار کیا کہ سورج کے دن یعنی سنڈے کو عیسائی مذہب کا مقدس دن مانا جائے۔

حضرت عیسیٰ کو پیغمبر ماننے والوں اور تثلیث کے ماننے والوں دونوں فرقوں میں بڑی شدومد سے لڑائیاں ہوئیں۔اور ہر دو فریق سخت تباہیوں سے دوچار ہوئے۔ پروٹسٹنٹ فرقہ کے لوگوں نے کیتھولک عیسائیوں کے بہت سے گرجے جلا دئے۔اور اسی طرح کیتھولک فرقہ والوں نے پروٹسٹنٹ فرقہ کے گرجوں کو مسمار کر دیا۔ (برطانیہ کے علاقہ آئر لینڈ میں یہ لڑائیاں ہر دو فرقوں کے درمیان آج بھی جاری ہیں۔) میرے خیال میں یہ سب اس لئے تھا کہ ہر چرچ یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ اس وقت کی لکھی ہوئی بائبل مصدقہ ہے اور ہر عیسائی کو اس کو ماننا اور اس کی پیروی کرنا چاہئے۔کیونکہ وہ اصلی اور حقیقی بائبل جو کہ پیغمبروں کی نوشتہ تھی پانے میں ناکام رہے اور آج بھی وہی نقلی کتاب بائبل کے نام سے پیش کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ عیسائی مذہب کا دعویٰ اس نقلی کتاب کی بنیاد پر غلط ہے۔

شیلڈرک خالد مزید کہتا ہے۔ ذرا غور کریں کہ یہ اسلام سے کتنا مختلف ہے۔کہ جس مذہب میں قرآن پاک حضرت محمدؐ نے جس طرح پہنچایا وہ حرف بحرف آج تک ویسے ہی موجود ہے۔ مسلمانوں نے ہر صدی اور ہر دور میں ہر قسم کے حملوں کا اس سچے قرآن کی موجودگی میں ہمت اور حوصلہ کے ساتھ مقابلہ کیا ہے۔عیسائیت کو چاہئے کہ اگر آنے والے طوفانوں سے نمٹنا ہے تو حقیقت کو تلاش کرے اور جس ہستی کو وہ مانتے ہیں اس کی زندگی کے تمام حقائق سچ کی بنیاد پر معلوم کریں۔

حق کی تلاش میں میں نے بدھ مت کا بھی مطالعہ کیا۔میں نے اس مذہب کی تعلیمات کو مذہب کی بجائے فلسفیانہ زیادہ پایا۔بھلا کیا یہ ممکن ہے کہ ایک لنگوٹ کس کر اور ہاتھ میں کشکول لے کر بھیک مانگنے سے کسی متلاشی کی مذہب کی ضرورت پوری ہو جاتی ہے۔ یا حضرت عیسیٰؑ کے ادھر ادھر گھومنے پھرنے سے مذہب کی حقیقت پوری ہو جاتی ہے۔نہیں، بالکل نہیں۔آج کی دنیا میں تو ایسے لوگوں کو مشتبہ قرار دیا جا سکتا ہے۔اور گرفتاری عمل میں آسکتی ہے۔

شیلڈرک خالد اپنی روحانی تشنگی کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے۔

درحقیقت مجھے ایک عملی مذہب اور دین کی ضرورت تھی۔ایسا دین نہیں جو زندگی کے خوابوں کو منتشر کر دے اور انسان کو دوسرے انسانوں سے دور کر دے۔ بلکہ ایسا دین، ایسا عملی مذہب، جو ہر گھڑی، ہر لمحہ میرے اپنے ذاتی معاملات اور میرے اور دوسروں کے درمیان روابط و معاملات میں قدم قدم پر رہنمائی کرتا ہے اس کی تلاش میں میں نے دنیا کے تمام مروجہ ادیان و مذاہب اور رسم و رواج کا بنظر غائر مطالعہ کیا۔لوگوں سے ملا اور ان سے بحثیں کیں۔لیکن یہ بات بالآخر مجھ پر منکشف ہوئی کہ میرے روحانی کرب کا درمان صرف اور صرف دین اسلام میں مل سکتا ہے اور یہ بھی بتا دوں کہ میں نے اسلام پر زیادہ لٹریچر نہیں پڑھا بلکہ میں تو یہ دیکھ رہا تھا کہ دین اسلام پر ہر طرف سے عیسائی مذہب کے پیروکار، لکھنے والے اور مبلغین مسلسل تابڑ توڑ حملے کئے

کئے جا رہے ہیں دل میں سوچتا تھا کہ آخر یہ عیسائی اسلام سے اتنے خوفزدہ کیوں ہیں اور مسلسل اس مذہب کی تضحیک اور برائیاں کیوں کرتے رہتے ہیں۔ میں نے تمام عیسائی ناقدوں کی ایک ایک کتاب جو میں حاصل کر سکتا تھا حاصل کی اور پڑھی اور پھر یہ حقیقت کھل کر مجھ پر آشکارا ہو گئی کہ "میں تو ایک مسلم ہوں"

عملی نقطۂ نظر سے اسلام کے جن زریں اصولوں نے مجھے متاثر کیا وہ یہ ہیں۔ اسلام شراب اور جوئے کی مخالفت کرتا ہے جب کہ عیسائی دنیا کی سب سے بڑی لعنت یہی جوا اور شراب ہیں۔ جہاں کہیں مسلم آبادیاں ہیں یہ دونوں چیزیں وہاں نہیں ہیں۔ اسلام ایک ترقی پسند مذہب ہے اور ہر دور اور صدی میں دنیا کے ہر مقامی جائز معاشرہ سے مطابقت کھاتا ہے۔ اور وہاں کے رہنے والوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتا ہے۔ یہ دن بدن ترقی کر رہا ہے اور کرتا رہے گا۔ یہاں تک کہ دنیا زیادہ سے زیادہ پاک اور صاف ہوتی رہے۔ اور دین کی روشنی سے لوگوں کے قلب منور ہوتے رہیں حضرت عیسیٰؑ کے متعلق بائبل ہمیں بہت ہی کم تفصیل مہیا کرتی ہے۔ لیکن حضرت محمدؐ کی روزانہ کی زندگی ہمارے سامنے ہے۔ اور راہنمائی کے لئے ان کی زندگی کا کوئی گوشہ ہم سے مخفی نہیں ہے۔ قدم قدم پر راہنمائی موجود ہے حضرتؐ محمدؐ کو تقریباً تیرہ سال تک سخت تکالیف اور مصائب کا سامنا رہا۔ لیکن انہوں نے مثالی ثابت قدمی اور انتہائی صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا اور دوسری طرف جو یہ فتح سے ہمکنار ہوئے تو ان پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑنے والے ان کے قدموں میں پڑے تھے۔ لیکن انہوں نے کمال فراخدلی سے سب کو معاف کر دیا حالاں کہ یہ چاہتے تو بدلہ لے سکتے تھے، ہم جانتے ہیں ان میں ذرا سا بھی غرور و تکبر نہیں تھا۔ اللہ اللہ! یہ استغنا کہ سارا عرب ان کے زیر نگیں تھا لیکن اپنے جوتوں کو خود ہی ٹانکتے تھے۔ انہوں نے اپنی تمام مال و متاع غلاموں کو آزاد کرانے اور ضرورت مندوں میں تقسیم کر دی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی ساری زندگی پیدائش سے وفات تک انسانیت کا ایک نادر نمونہ مثال ہے۔ اسلام ضبطِ نفس اور ایثار کی تعلیم دیتا ہے۔ اور یہی چیزیں ہمیں دنیا میں امن و آرام دیتی ہیں۔ اور جنت کی طرف لے جاتی ہیں۔ بات یہ ہے کہ محض عقیدہ، عمل کے بغیر بیکار ہے۔ اسلام میں عقیدہ اور عمل ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ خدا کی وحدانیت اور تمام بنی نوع انسان کی بھائی چارگی ہی اسلام کا تمام عالم کے لئے اور بالخصوص مغرب کے لئے پیغام ہے۔ بلاشک و شبہ یہ ایک ایسا پیغام ہے جس پر ہر انسانیت پسند کو فخر کرنا چاہئے۔

شیلڈرک خالد اپنی سرگذشت کا اختتام کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مجھے یہ خیال نہیں آتا اور نہ ہی افسوس ہوا کہ میں کیوں اپنا آبائی مذہب ترک کر کے مسلمان ہوا۔ میرے لئے یہ خیال باعث فخر ہے نہ کہ وجہ شرمندگی کہ میں نے کیوں اللہ اور اس کے رسول حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلیم کرتے ہوئے اس دین فطرت یعنی اسلام کو گلے لگایا ہے۔

نوٹس برائے طلبی ٹینڈر

مندرجہ ذیل کام کے لئے محکمہ ایریگیشن اور پبلک ہیلتھ انجینئرنگ ڈیپارٹمنٹ سے منظور شدہ ٹھیکیداروں سے جنہوں نے سالانہ رجسٹریشن برائے سال ۱۹۸۶ء - ۱۹۸۵ء کی تجدید کی ہو، سربمہر ٹینڈر مطلوب ہیں:

نمبر شمار	کام کا نام	تخمینہ لاگت	زرضمانت	میعاد تکمیل	ٹینڈر کھولنے کی تاریخ
۱۔	تحفظ از سیلاب دریائے ادیزئی زرعی اراضی و آبادی دیہہ مواضعات گنڈر سنڈی دادوزئی واگرہ (تعمیر سپر ۴×۳ برائے تحفظ دیہہ اگرہ)	۲٫۰۰۰٫۰۰۰/-	۴۰٫۰۰۰/-	دو ماہ	۲۳-۱۱-۸۵

(i) درخواست برائے حصول ٹینڈر مندرجہ بالا کام کیلئے مقررہ تاریخ سے ایک دن پہلے دو بجے تک زیر دستخطی کے دفتر میں پہنچ جانی چاہئیں۔ اور پھر مندرجہ بالا تاریخ مستحق ٹھیکیداروں کو ٹینڈر فارم جاری کئے جائیں گے۔ سربمہر ٹینڈر ۱۱:۳۰ بجے تک وصول کئے جائیں گے اور اسی دن ۱۲ بجے ٹھیکیداروں کے روبرو کھولے جائیں گے۔

(ii) نقد زرضمانت بحق ایگزیکٹو انجینئر پشاور کینالز ڈویژن ٹینڈر فارم کے ساتھ منسلک ہونا چاہیئے۔

(iii) مشروط یا بذریعہ تار ٹینڈر منظور نہیں ہوں گے۔

(iv) مزید معلومات بابت کام اور شرائط دفتر بالا سے کسی بھی یوم کارکردگی دفتری اوقات میں حاصل کی جا سکتی ہیں۔

حضرت اللہ خان
ایگزیکٹو انجینئر پشاور کینالز ڈویژن پشاور

INF (P) 3009

بہترین لباس تقویٰ کا لباس ہے
"لباس التقوىٰ ذلك خير"
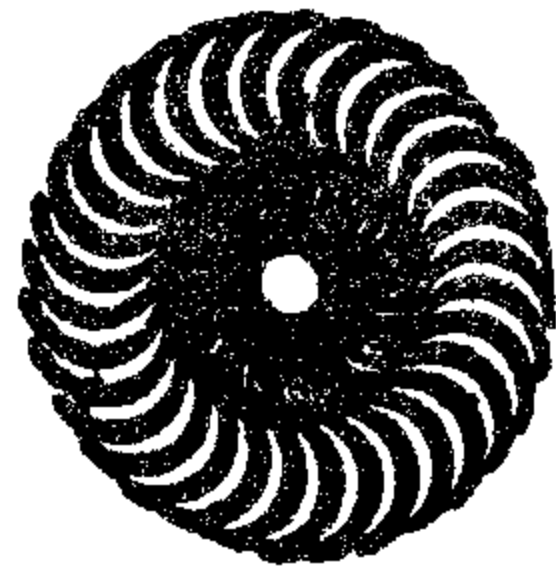
قسط نمبر ۳

حضرت اخوند درویزہؒ کے حالات اور تصانیف

ڈاکٹر قاری عبدالغفور پشاور یونیورسٹی

۴۔ قصیدۂ بردہ

یہ مشہور قصیدہ امام شرف الدین محمد بن سعید البوصیری (المتوفی ۶۹۴ھ - ۱۲۹۴ء) کا ہے۔ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفات بیان ہوئی ہیں۔ طرزِ تصوف پر تحریر ہوا ہے۔ اور اہلِ تصوف اس میں بہت سی خوبیاں پاتے ہیں۔ اخوند درویزہ نے اس کو بھی پشتو میں شامل کر کے بطورِ وظیفہ پشتو پڑھنے والوں کے لئے آسان کیا ہے۔ کیونکہ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور وعظ و نصائح شامل ہیں۔

مخزنِ اسلام پشتو کی وہ واحد درسی کتاب ہے جو ایک عرصہ تک پٹھانوں کے ہر گھر اور مسجدوں میں علماء کرام کے خطبوں بزرگوں کے وظائف اور نوجوانوں کی محفلوں میں پڑھی جاتی رہی۔ یہی نہیں بلکہ اس میں بیان کردہ مسائل کی روشنی میں قاضی فتوے دیتے تھے[2]۔

افغانوں کے مشہور صاحبِ سیف و قلم خوشحال خان خٹک (المتوفی ۱۱۰۱ھ - ۱۶۸۹ء) نے بھی حضرت اخوند درویزہ کے مخزنِ اسلام کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

دوہ څیزونہ دی پہ سوات کښې۔ کہ خفی دی کہ جلی[3]

یو مخزن د درویزہ دے بل دفتر وشیخ ملی

ترجمہ۔ سوات میں دو چیزیں قابلِ قدر ہیں خواہ وہ پوشیدہ ہوں یا اعلانیہ جن میں ایک اخوند درویزہ کا مخزن ہے اور دوسرا شیخ ملی کا دفتر۔

۲۔ ارشاد المریدین۔

آپ کی یہ کتاب حقائق تصوف و معارف پر مبنی ہے۔

اس میں آپ نے سلوک[1] اور تصوف کے اصول اور قواعد بیان کئے ہیں جس کے پڑھنے، سمجھنے اور عمل کرنے
نسان صحیح معنوں میں صوفی کہلاتا ہے۔ اور اس سے وہ تمام اصول سیکھتا ہے جو تصوف کی راہوں کو آسان کر دیتا
۔ اس کتاب کو سمجھنا کچھ آسان نہیں۔ بعض علمار تصوف نے اس کو "ہمعات"[2] کے برابر سمجھا ہے[3] اس کے کل ۸۰
ت ہیں۔ یہ آپ کی انتہائی مشکل ترین کتاب ہے۔
یہ کتاب مطبع حسینی دہلی کے زیر اہتمام ۱۹۴۹ میں چھپ چکی ہے اور اس کا ایک نسخہ حضرت امیر شاہ[4] صاحب
ی سجادہ نشین آستانہ غوثیہ یکہ توت پشاور شہر کی ذاتی لائبریری میں موجود ہے۔

۳۔ ارشاد الطالبین

اخوند درویزہ کی یہ تالیف فارسی زبان میں ہے۔ ۵۵۲ صفحات اور چار ابواب پر مشتمل ہے۔ اور ہر باب میں کئی
سول ہیں۔ پہلا باب جو حصہ اول کہلاتا ہے اس میں چار فصلیں ہیں جس میں توحید۔ ایمان۔ وضو۔ نماز کی حقیقت اور
یلت بیان کی گئی ہے۔ دوسرے باب کو بھی چار فصلوں میں بھی تقسیم کیا گیا ہے فصل اول میں توبہ۔ فصل دوم میں
رکامل کی شناخت اور علامتیں فصل سوم میں علم اور فصل چہارم میں ذکر الٰہی کا بیان پوری وضاحت کے ساتھ
یا گیا ہے[5]
باب سوم صرف تیرہ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں سلوک کا ذکر ہے اور چار اہم باتوں کا بیان ہوا ہے۔

---

[1] سلوک کے لفظی معنی ہیں راستہ چلنا یا طے کرنا اور اصطلاح تصوف میں اس سے مراد یہ ہے۔ شرعی حدود کے اندر رہتے
ہوئے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کے لئے ریاضت اور جدوجہد کرنا۔ جو شخص حق کی اس کوشش میں مشغول ہوتا ہے اس کو
سالک کہتے ہیں (سردلبران ص ۹۹) [2] یہ کتاب فلسفہ تصوف کی تاریخ ہے کل ۲۰ صفحات پر مشتمل ہے اور ۲۱ ہمعات ہیں۔ اس کے
مصنف حکیم الہند امام ولی اللہ دہلوی (المتوفی ۱۷۶۲ء) ہیں آپ نے حکمت کا مستقل سکول قائم کیا۔ جو نہضۃ ہندیہ کے لئے بمنزلہ
اساس ہے۔ آپ کو سلوک اور تصوف کا امام بھی کہا جاتا ہے (ماخوذ دیباچہ ہمعات) [3] تصوف کی حقیقت ص ۱۱۷ از
محمد علی خان۔ [4] سید امیر شاہ قادری پشاور شہر کے سادات گھرانے کے مشہور چشم و چراغ ہیں۔ آپ شاہ محمد غوث پشاوری
ثم لاہوری کی اولاد میں سے ہیں۔ فطرتاً حلیم الطبع، انتہائی ملنسار اور فیاض شخصیت ہیں۔ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔
خاص کر آپ نے تذکرہ مشائخ سرحد نامی کتاب لکھ کر بہت سے بزرگان دین کے حالات اکٹھے کئے۔ جو صوبہ سرحد کے علماء کی بہت
بڑی خدمت ہے۔ آپ کی اپنی ذاتی لائبریری بھی ہے جس میں نادر قلمی نسخوں کے علاوہ دیگر بہت قیمتی اور قدیمی کتابیں ہیں۔ اکثر
ریسرچ کرنے والے طلباء اس سے فائدہ حاصل کرتے ہیں اور آپ تحقیق کرنے والوں کی خوب خاطر تواضع کرتے ہیں۔
[5] ارشاد الطالبین ص ۳

موضوعات میں سیر من اللہ[1]۔ سیر الی اللہ[2]۔ سیر فی اللہ[3] اور سیر مع اللہ[4] شامل ہیں۔ باب چہارم بھی چار فصلوں پر مشتمل ہے اس میں اخلاقِ حمیدہ۔ رذیلہ، صبر اور شکر کا بیان ہے۔

اس کے علاوہ آپ نے اس کتاب میں مختلف جگہ ضمناً اپنے پیر و مرشد حضرت پیر باباؒ کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب بھی زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی ہے۔ اور اس کا بھی ایک نسخہ مطبوعہ مطبع فیض عام دہلی ۱۲۹۶ھ سید امیر شاہ صاحب کی ذاتی لائبریری میں موجود ہے۔

۴۔ تذکرۃ الابرار

آپ کی یہ معرکۃ الآرا تصنیف بھی فارسی میں ہے جسے آپ نے اسّی برس کی عمر میں مرتب کیا۔ یہ کتاب ۲۴۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اسے تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے حصے میں دیگر مختلف واقعات کے علاوہ آپ نے اپنے پیر و مرشد حضرت بابا پیر کے حالاتِ زندگی تفصیل سے بیان کئے ہیں[5] چونکہ آپ کے پیر و مرشد پیر بابا کی سوانح پر بہت کم کتابیں ملتی ہیں۔ لہٰذا اکثر مصنفین مذکورہ کتاب سے ان کے حالات بآسانی معلوم کرتے ہیں۔

دوسرے حصے کا آغاز اس موضوع سے ہوتا ہے۔

"ذکر احوال و انساب و اعمال افغانان و کیفیت الحاق ابن فقیر"[6]

یعنی اس حصے میں پٹھانوں کے انساب افغانوں کی (بدعملی) کا بیان کرتے ہوئے حضرت اخوند رویزہ نے اپنے حالات بھی تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ یہی وہ کتاب ہے جس میں کہ آپ کے حالاتِ زندگی کا مکمل پتہ چلتا ہے۔

حصہ سوئم میں آپ نے اپنے عہد کے ان لوگوں کا ذکر فرمایا ہے جن کو آپ برا سمجھتے تھے اور ان کے عقائد کو باطل قرار دیتے تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ تذکرہ ان تحریکات کی عکاسی کرتا ہے جو دسویں صدی ہجری میں صوبہ سرحد کے

---

[1] سیر من اللہ وہ منزل ہے جس میں سالک حق تعالیٰ کے قریب ہو جاتا ہے مگر وہ اپنے وجود کی خبر رکھتا ہے۔ بےخبر نہیں (مکتوبات حضرت شیخ فقیر اللہ شکارپوری ص ۳۸۸) [2] سالکین کو قرب خداوندی کے حصول کی کوشش اور سلوک کے مختلف منازل طے کرنے میں جن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ ان میں سے ایک مرحلہ سیر الی اللہ کے نام سے موسوم ہے۔ جس میں سالک کی نگاہ اپنے آپ سے کٹی ہوئی ہوتی ہے۔ کہ اگر تیز تلوار بھی اس کی راہ میں موجود ہو تو اس کو عبور کر کے بھی محسوس نہیں کرے گا (سر دلبران ص ۹۹) [3] یہ راہ سلوک کی وہ منزل ہے جس پر پہنچ کر سالک الیسا فی اللہ ہو جاتا ہے کہ اپنے وجود سے بھی بےخبر ہو جاتا ہے (مکتوبات حضرت شیخ فقیر اللہ شکارپوری ص ۳۸۸) [4] سیر مع اللہ حقیقت کا وہ مرتبہ ہے جس پر فائز ہونے کے بعد سالک کو اپنے فنا فی اللہ ہونے کی بھی خبر نہیں رہتی۔ اس مرتبے کو فناء الفنا بھی کہتے ہیں (مکتوبات ص ۳۸۸) [5] تذکرۃ الابرار والاشرار ص ۱۱ [6] ایضاً ص ۷۹

علمی، روحانی اور سیاسی حالات پر اثر انداز ہوئیں تو بے جا نہ ہو گا۔ خصوصاً تحریک روشنیہ کا ذکر بڑی شدت سے کیا گیا ہے۔ جیسا کہ اس کتاب کے نام سے ظاہر ہے کہ اس میں اچھے اور برے لوگوں کا تذکرہ ہے۔ تو یہ بالکل درست ہے۔ حضرت اخوند رویزہ نے اپنے پیرومرشد کو اور چند دیگر شخصیتوں کو ابرار اور آخری حصہ میں ذکر شدہ لوگوں کو اشرار ٹھہرایا۔ اور ان کی خرابیوں کا تفصیل سے ذکر کیا۔ ان میں اکثریت کے ساتھ انہوں نے خود مناظرے بھی کئے۔ جس میں بقول حضرت اخوند رویزہ کے خود ان کو کامیابی ہوئی[1]

یہ کتاب قلمی شکل میں پشتو اکیڈمی میں موجود ہے۔ تاہم یہ اب چھپ بھی چکی ہے اور بازار میں بکثرت دستیاب ہے۔ اس کی سب سے پہلی اشاعت ماہ شعبان ۱۳۷۹ھ ۱۹۶۰ء کو ادارہ اشاعت سرحد پشاور نے کی۔

۵۔ تذکرۃ الانساب

حضرت اخوند رویزہ کی کتب میں سے ایک کتاب تذکرۃ الانساب کا حوالہ بھی ملتا ہے۔ جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے پٹھانوں اور سادات خاندان کے نسب ناموں اور شجروں کا ذکر کیا ہے جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ نہ صرف ایک جید عالم دین اور صوفی رہنما تھے بلکہ وہ مختلف قسم کی تصنیف و تالیف میں بھی کافی مہارت رکھتے تھے۔ ان کی اس کتاب کا حوالہ "مجمع البرکات" نامی کتاب میں کچھ یوں ذکر ہوا ہے :-

" بدانکہ مناقب سادات کہ تصنیف شیخ نجم الدین صوفی است۔ در تذکرۃ الانساب از تصانیف اخوند رویزہ ننگرہاری وغیرہ ذالک[2]

ترجمہ۔ جان لو کہ مناقب سادات نامی ایک (کتاب) جو شیخ نجم الدین صوفی کی ہے اور اس کا ذکر تذکرۃ الانساب میں ہے جو کہ حضرت اخوند رویزہ ننگرہاری کی تصانیف میں سے ہے۔

اس کتاب میں انہوں نے ارشاد کبیر کا ذکر بھی کیا ہے۔ مگر اس سے مراد ارشاد الطالبین لیا جا سکتا ہے۔ اور تذکرۃ الانساب سے تذکرۃ الابرار والاشرار اس لئے مراد نہیں لیا جا سکتا کہ موخر الذکر کثیر تعداد میں ہے۔ اور یہ ان کی بے حد مشہور کتاب ہے۔

۶۔ شرح اسماء الحسنیٰ

یہ کتاب بھی حضرت اخوند رویزہ کی تالیفات میں سے ہے۔ ساٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ اور زبان فارسی ہے۔ اس کتاب میں اللہ تعالیٰ کے ناموں کی وضاحت اور اہمیت بیان کرنے کے علاوہ ہر اسم مبارک کی خاصیت بھی بیان فرمائی گئی ہے۔ جو مشکلات کے حل کے لئے بطور ورد اور وظیفہ کے استعمال کی جا سکتی ہیں۔

---

[1] تذکرۃ الابرار ص ۱۵۹ [2] مجمع البرکات ص ۳

سب سے پہلے ذاتی نام "اللہ" سے شروع کیا گیا ہے۔

اس کتاب کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ہر ورق کے حاشیے پر عربی کے شعر بیان کئے گئے ہیں اور یہ اشعار نصف کتاب تک ہیں[1] اور ان اشعار میں بھی اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ کی تعریف کی گئی ہے جس سے حضرت اخوند رویزہ کی علمیت کے علاوہ آپ کو عربی کا ایک بہترین شاعر بھی کہا جا سکتا ہے۔

اس کتاب کا مطبوعہ نسخہ بھی حضرت امیر شاہ قادری صاحب کی ذاتی لائبریری میں موجود ہے جس کی طباعت مطبع پشاوری قصہ خوانی پشاور کے زیر اہتمام ۱۲۸۳ھ کو ہوئی ہے۔

۷۔ شرح قصیدۂ امالی۔

یہ ایک مختصر رسالہ ہے اور کل ۴۵ صفحات پر مشتمل ہے اس کی زبان فارسی ہے یہ رسالہ ۱۲۷۰ھ میں چھپ چکا ہے کتاب کا موضوع علم کلام ہے اس میں اہل ایمان کے صحیح عقیدے کا بیان ہے تاکہ لوگ دین کی خیر خواہی سے آگاہ ہو سکیں۔ حضرت اخوند درویزہ نے اس میں اہل السنت والجماعۃ کے عقائد کے بیان کے ساتھ ساتھ بالاختصار عقائد باطلہ کا ابطال و رد بھی فرمایا ہے۔

کتاب اختصار کے باوجود نہایت پر معلومات اور دلچسپ ہے اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ موقع کی مناسبت سے بعض جگہ فقہی احکام و مسائل کو بھی قلم بند فرمایا ہے۔

مذہب اہل السنت والجماعۃ کی تعریف کرتے ہوئے آپ لکھتے ہیں کہ

"ہر چہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کردہ باشد و یا گفتہ باشد۔ و بعد از پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام ہر چہ یاران او گفتہ باشند و یا کردہ باشند و بعد ازاں امامان دین برآں رفتہ باشند آں را مذاہب اہل السنت والجماعۃ می گویند[2]"

ترجمہ۔ یعنی جو کچھ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کیا ہو یا فرمایا ہو اور آپ کے بعد جو کچھ صحابہ نے کیا ہو۔ یا فرمایا ہو اور بعد ازاں دین کے ائمہ اس پر عمل پیرا رہے ہوں اس کو اہل السنت والجماعۃ کا مذہب کہتے ہیں۔

آپ اہل السنت والجماعۃ کے صحیح علمبردار تھے یہی وجہ ہے کہ اہل السنت والجماعۃ کے مذہب کی مخالفت کرنا آپ کفر کے مترادف قرار دیتے ہوئے ایک جگہ فرماتے ہیں۔

" اگر شخص در وقت بدی کردن بگوید کہ ایں را برضائے خدا تعالیٰ میکنم کافر گردد۔ زیرا کہ خدائے تعالیٰ را بہ بدی راضی دانستن خلاف مذہب سنت و جماعت است۔ و خلاف نمودن مذہب سنت و

---

[1] شرح اسماء الحسنیٰ ص۴۳ [2] شرح قصیدہ امالی ص۵

جماعت را کفر باشد۔ لقولہ علیہ السلام"

من فارق الجماعۃ قدر شبر فقد خلع ربقۃ الاسلام من عنقہ[۱]

یعنی ہر کہ سخن مذہب سنت وجماعت را خلاف نماید پس تحقیق گلو بند اسلام را از گردن خود بیرون آوردہ باشند[۲]

ترجمہ۔ اگر کوئی شخص برائی کرتے وقت یہ کہے کہ خدا کی مرضی سے یہ کام کرتا ہوں تو وہ کافر ہے اس لئے کہ خدا کو گناہ پر راضی سمجھنا مذہب اہل السنت والجماعۃ کے خلاف ہے اور اہل السنت والجماعۃ کے مذہب کا خلاف کرنا کفر ہوگا۔ جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص اہل سنت کی جماعت کی مخالفت کرے گا پس تحقیق اس نے اسلام کا گلو بند اپنے گلے سے اتار دیا۔

راقم الحروف کے نزدیک ضروری ہے کہ اس قصیدے کے متن علام کے بارے میں وضاحت کی جائے۔ اخوند کتاب کے آغاز میں شارح قصیدہ لکھتے ہیں کہ

امابعد میگوید فقیر الی اللہ الباری درویزہ بن اخوند گدا ننگرہاری غفر اللہ لہ ولوالدیہ کہ چوں قصیدۂ امالی کہ منسوب است بہ سوئے محمد نجم الدین عمر النسفی[۳]

مذکورہ بالا عبارت میں حضرت اخوند رویزہ قصیدۂ امالی کو محمد نجم الدین عمر نسفی کی تصنیف تسلیم کرتے ہیں جو محل نظر ہے کیونکہ قصیدۂ مذکورہ مذہب حنفی کے ایک جلیل القدر عالم سراج الملت والدین علی بن عثمان الاوشی کی مشہور تصنیف ہے[۴]

حضرت میاں محمد عمر چمکنی رحمۃ اللہ علیہ طبقات حنفیہ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ

علی بن عثمان الاوشی الامام العلام المحقق سراج الملۃ والدین لہ قصیدۃ المشہورۃ فی اصول الدین ستۃ وستون بیتًا اولہا۔

یقول العبد فی بدء الامالی

لتوحید بنظم کالالی[۵]

یعنی اصول دین کے باب میں امام علام محقق سراج الملۃ والدین علی بن عثمان الاوشی کا مشہور قصیدہ ہے۔ جو چھیاسٹھ (۶۶) ابیات پر مشتمل ہے۔

باقی ص۴۷ پر

---

[۱] ابوداؤد شریف باب فی قتل الخوارج کتاب السنۃ ص ۶۵۵ ج۲ [۲] شرح قصیدہ امالی ص۵ [۳] ایضاً ص۳ [۴] المعالی شرح امالی (قلمی) از میاں محمد عمر چمکنی ۱۱۵۸ھ ص۱۱ ھ ۱ ولباب المعارف [۵] المعالی ص۱۲

عصرِ حاضر میں اسلامی اقدار کی مناسبت

از مولانا رحمت اللہ قاسمی ۔ انڈیا

"عصرِ حاضر سے اسلامی اقدار کی مناسبت" کا مسئلہ آج کل جگہ جگہ موضوعِ بحث بنا ہوا ہے اور ایسی اہمیت اختیار کر چکا ہے کہ بین الاقوامی سطح سے لے کر ایک فرد کی نجی زندگی تک اس کا اثر پہنچ چکا ہے۔ اس موضوع پر اس وقت خوب قلمی اور زبانی معرکے گرم ہو رہے ہیں۔ اور ہر شخص اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر رہا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ "خالقِ عقل" اور "حکیمِ کل" کی بتائی ہوئی راہ کو اختیار کئے بغیر یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ وقت کے محدود ہونے کی بنا پر اس وسیع موضوع پر مکمل یا تفصیلی بحث تو اس وقت ناممکن ہے البتہ اپنی مختصر معلومات کے پیشِ نظر اس سلسلے میں کچھ باتیں گوش گزار کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔

اسلام جن تعلیمات، عقائد، تہذیب و تمدن اور آسمانی اصولوں کو لے کر آیا ہے ان کے بارے میں خود اس نے اعلان کیا ہے کہ یہ کامل مکمل اور ابدی ہیں۔ حجۃ الوداع کے موقع پر اعلانِ عام ہوا کہ

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ (مائدہ ۵)

آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کی۔

جب ان اصولوں کو کامل قرار دیا گیا تو ان کا ہر دور کی تمام ضرورتوں پر حاوی ہونا لازمی بن جاتا ہے تاکہ کوئی بھی شعبہ کسی بھی وقت تشنہ نہ رہے۔ چنانچہ زندگی کے ہر ہر موڑ پر رہنمائی کرنے والے اصول موجود ہیں اور صرف رہنمائی ہی نہیں کرتے بلکہ یہ زندگی کے نگراں بھی ہیں کہ غلط راہ پر گامزن ہونے سے روکتے ہیں۔ آج کل اس بات کا دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ موجودہ سائنسی دور میں ان اصولوں پر عمل مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ اور دلیل میں اس وقت کے عام مسلمانوں کے حالات کو پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ استدلال غلط ہے اگر کسی نظریہ کے ماننے والے اس نظریہ کے اصولوں کو اپنے لئے مشعلِ راہ نہیں بناتے اور ان کو اپنی زندگی میں نافذ نہیں کرتے۔ تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ نظریہ یا مذہب یا اس کے اصول غلط ہیں بلکہ اس کو اس مذہب کے ماننے والوں کی غلطی کہا جائے گا۔

ہے۔ نیز مذہبی
اسلام وہ دین ہے جس نے انسان کے تمام انفرادی اور اجتماعی مسائل کا حل پیش کیا
امور کے ساتھ ساتھ سیاسی، سماجی اور اقتصادی ضروریات کی طرف بھی رہنمائی فرمائی ہے اور یہ رہنمائی
ہر وقت اور ہمیشہ اس وقت ملتی ہے جب اس کو تلاش اور طلب کیا جائے۔ سائنسی اور غیر سائنسی تمام
ادوار میں اس کے اصول تعلیمات اور اقدار بالکل موزوں مناسب اور قابل عمل ہیں۔ بارہا میں نے اپنے
اساتذہ شیخ الحدیث علامہ انور شاہ کشمیریؒ کا مقولہ بارہا سنا ہے کہ فلسفۂ قدیم میں تو اسلامی نظریات کے
ساتھ کہیں کہیں تضاد پایا جاتا تھا۔ لیکن فلسفۂ جدید اور سائنسی تحقیقات، اسلامی اقدار کی تائید ہی کریں گے۔
یہاں پر مجھے اسلامی اقدار کی موزونیت اور مناسبت بیان کرنے کی کوشش کرنی ہے۔ جو عام انسانیت
سے متعلق ہیں۔

تعلیم و تربیت | اسلام نے بنیادی طور پر تعلیم پر انتہائی زور دیا ہے۔ یہاں یہ بنیادی نقطہ ذہن نشین
رہنا چاہیئے کہ اسلام تعلیم کو عبادت قرار دیتا ہے۔ ذریعۂ معاش یا تجارت نہیں۔ عرب کے اس ماحول میں
جہاں تعلیم یافتہ افراد کا تناسب مشکل سے ایک یا دو فیصد تھا۔ دعوتِ ایمان کے بعد سب سے پہلے تعلیم کی طرف
توجہ دلائی گئی اور تا ابد یہ پیغام باقی رہے گا۔

هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ — کیا علم والے اور جاہل برابر ہو سکتے ہیں۔؟
وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ (زمر) — (یعنی نہیں ہو سکتے)

اور کسی خاص عدد یا ذات کے لیے یہ تاکید نہیں ہے۔ بلکہ ہر فرد کو اس کا مکلف قرار دیا گیا ہے چاہے
مرد ہو یا عورت۔ بوڑھا ہو یا جوان جب تک معاشرے کے سو فی صد افراد علم سے بہرہ ور نہیں ہوتے تب تک یہ
ذمہ داری ختم نہیں ہو سکتی۔ اور کسی خاص طبقے پر اس کی ذمہ داری نہیں۔ بلکہ ہر آدمی اپنی جگہ پر اس بات کا جواب دہ
ہے کہ وہ جو کچھ جانتا تھا دوسروں تک پہنچایا یا کہ نہیں؟

حضورؐ نے صاف اعلان فرمایا:۔

بَلِّغُوا عَنِّي وَلَوْ آيَة (الحدیث) — اگر ہماری ایک ہی بات کا علم ہو تو اس کو دوسروں تک پہنچا دو۔

نیز مزید فرمایا:۔

بُعِثْتُ مُعَلِّمًا (الحدیث) — مجھ کو معلم بنا کر بھیجا گیا ہے۔

پھر صرف تعلیم ہی کو مقصد نہیں بتایا گیا۔ بلکہ واضح کر دیا گیا کہ عمل کے بغیر چارہ کار نہیں بلکہ صرف بلند بانگ
دعووں سے کچھ نہ ہوگا۔ بلکہ عملی طور پر اس کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ غرض تربیت کو تعلیم کا جزو لاینفک قرار دیا گیا۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے اپنے اساتذہ، درسگاہوں، کتابوں اور تعلیم کے انتظام میں معاون افراد حتیٰ کہ کاغذ کے پُرزوں تک کی تکریم اور احترام کرنے کو کہا گیا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے اندر فروتنی، عاجزی، انکساری محنت کشی اور تحمل کی عادت پیدا کرنے کی از حد تاکید کی گئی۔ اپنے اسلاف میں اس کی لاتعداد مثالیں موجود ہیں۔ دور نہ جائیں ابھی سات آٹھ سال قبل اس عالم فانی سے رخصت ہونے والے اپنے ہی وطن کشمیر کے مایۂ ناز فرزند علامہ محمد صدیق کشمیریؒ کے بارے میں پڑھا ہے کہ صرف روٹی جیب میں لاکر رکھتے تھے۔ اور جونہی موقع ملتا کھا لیتے۔ یہی ان کی کل غذا تھی۔ اپنے وقت کی بچت کے پیش نظر سالن کے استعمال کو ترک ہی کر دیا۔ علمی دنیا نے انہیں امام النحو کا خطاب دیا تھا۔

امام جلیل امام ابوحنیفہؒ جنہیں دنیا امام اعظم کے نام سے پکارتی اور پہچانتی ہے کے بارے میں ان کے استاد حضرت حمادؒ کی ہمشیرہ عاتکہ فرماتی ہیں کہ امام صاحب ہمارے گھر کی روئی دُھنتے تھے۔ دودھ ترکاری لا کر دیتے اور بہت سارے کام کیا کرتے تھے۔ آج یہ حقیقت ہمارے سامنے ہے کہ حماد کے گھر کا یہ خادم تمام عالم کا مخدوم بن گیا۔

مشہور امام فخر الدینؒ کو مرو میں دیکھا گیا کہ بادشاہ ان کی بہت تعظیم کرتا اور آپ بار بار فرماتے کہ میں نے عزت اور سلطنت محض استاد کی خدمت سے پائی۔ کیونکہ میں اپنے استاذ قاضی امام ابوزید دبوسی کا تیس سال تک متواتر کھانا پکاتا رہا اور خود ادب کی وجہ سے اس میں سے کچھ بھی کھانے کی جرأت نہ کرتا تھا۔

شمس الائمہ حلوائی فرماتے ہیں کہ ہم کو علم جو بھی حاصل ہوا اس میں علم کی عظمت کو بڑا دخل ہے۔ یہ کبھی کتاب کیا سادہ کاغذ کو بھی بغیر وضو کے نہیں چھوتے تھے۔

اپنے اسلاف کی یہ چند مثالیں تعلیم وتربیت کی آپ کے سامنے پیش کر دیں۔ اگر اسلام کی اسی قدر کو عام کیا جائے اور اسی پر عمل کی کوشش کی جائے تو دور حاضر کے تمام مدارس، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں کیا اسٹرائکوں اساتذہ کرام کی بے حرمتیوں اور املاک کے نقصان کی بدعت جاری رہ سکتی ہے؟ پھر کیا مردم سازی اور علم دوستی کی وہ فضا دوبارہ عود نہیں کر سکتی جس پر معاشرے کی اصل بنیادیں تعمیر ہوتی ہیں اور جس کے نتیجے میں قابل تقلید سلطنتیں اور اچھوتے ماحول وجود میں آتے ہیں۔

۲۔۱۰ ایثار اسلام کی ایک اہم قدر ایثار ہے۔ پہلے تو ہر متنفس کا حق الگ الگ بیان کیا۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ (النساء پ۵)

اور تم اللہ کی عبادت اختیار کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک مت کرو۔ اور والدین کے
ساتھ اچھا سلوک کرو۔ اور اہل قربت کے ساتھ بھی اور یتیموں، غریب غربا، پاس والے پڑوسی
ہم مجلس، راہ گیر اور ان کے ساتھ بھی جو تمہارے مالکانہ قبضے میں ہیں۔
ملاحظہ فرمائیں کہ راہ گیروں تک کا حق بیان کیا گیا۔ پھر کچھ حقوق ایسے ہیں جو آپسی عقود اور معاملات کی
وجہ سے لازم ہو جاتے ہیں۔ ان میں بھی اس بات کا خاص خیال رکھا گیا کہ یہ عقود بھی آپسی تعلق اور محبت بڑھانے
میں معاون ہوں۔ مثال کے طور پر کسی چیز کو بیچا جا رہا ہے گاہک اسے خریدنا چاہتا ہے۔ گاہک کی وقتی مجبوری اور
ضرورت کے پیش نظر ادھار خریدنے کی اجازت دے دی گئی۔ لیکن اس بات کا پابند بنایا گیا کہ وقت معین کرے
کیونکہ ادائیگی کا وقت متعین و معلوم ہوگا۔ تو کسی قسم کے تفرقے یا نزاع کا اندیشہ نہیں ہوگا۔ ہر ایسا معاملہ جس
میں نتیجۃً جھگڑے یا اختلاف کا امکان ہے۔ اس کو غلط قرار دیا جائے گا۔

یہاں یہ بات بھی معلوم رہے کہ شریعت کے جزوی احکام بھی اپنے اندر مستقل اصولوں کو سموئے ہوئے ہیں
اسی وجہ سے یہاں یہ اصول اس بات کو قرار دیا گیا کہ اجل مجہول پر (جس کی ادائیگی کا وقت معلوم نہ ہو) قرضہ دینا
ناجائز ہے۔ بغرض حقوق چاہے کیسے بھی ہوں ان کی ادائیگی پر زبردست زور دیا گیا ہے۔
مشہور حدیث شریف ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے دریافت کیا کہ بتاؤ مفلس کون
ہے؟ عرض کیا کہ ہم مفلس اسے کہتے ہیں جس کے پاس مال و دولت، روٹی کپڑا اور مکان نہ ہو۔
فرمایا، نہیں وہ مفلس نہیں بلکہ میری امت کا مفلس وہ ہے جو قیامت کے روز بہت سارے اعمال کے ساتھ
حاضر ہوگا۔ لیکن اس نے بے شمار حقوق پامال کئے ہوں گے۔ حق داروں کے حقوق کے عوض میں جب اس کے اعمال تقسیم
کئے جائیں گے تو اس کے تمام اعمال ختم ہو جائیں گے۔ لیکن لوگوں کے حقوق پھر بھی باقی رہیں گے۔ لہٰذا حق داروں کے گناہ
بقدر حقوق اس کے اوپر لادے جائیں گے۔ جس سے یہ آخرکار جہنم رسید ہوگا۔ العیاذ باللہ منہ۔

حقوق کی ادائیگی پر ہی بس نہیں کیا گیا بلکہ مزید ایثار کا حکم دیا گیا اور ایثار کرنے والوں کو سراہا گیا۔

وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (حشر پ ۲۸)

اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود فاقے سے ہوں۔
ان اصولوں کے اثرات کیا ہوئے تاریخ ان واقعات سے بھری پڑی ہے۔ خود آقائے دوجہاں ایک موقع پر
اعلان فرما رہے ہیں کہ اگر کسی کا مجھ پر کوئی حق ہے یا کسی پر زیادتی ہوئی ہے تو وہ مجھ سے دنیا ہی میں بدلہ لے لے۔
ایک جاں نثار صحابیؓ نے موقع کو غنیمت جانتے ہوئے اپنا مطالبہ پیش کیا تو پیارے نبیؐ نے مطالبے پر اپنے
بدن مبارک سے کرتہ ہٹا کر اس کے سامنے پیش کیا۔ اور اس صحابیؓ نے مہر نبوت کو چوم کر اپنی دلی مراد حاصل کر

لی۔ اور ایثار کی مثالیں تو زبان زدِ عوام و خواص ہیں۔

اس بات میں حضرت ابوجہم ابن حذیفہ رضؓ کی روایت ہی کافی ہے کہ یرموک کا معرکہ زوروں پر ہے۔ میدانِ کارزار گرم ہے پانی ساتھ لے کر ابوجہم اپنے چچا زاد بھائی کو تلاش کرنے کے بعد اس حال میں پاتے ہیں کہ وہ دم توڑ رہے ہیں۔ اور جانکنی شروع ہے جونہی پانی پلانے کا ارادہ کیا تو قریب سے کسی قریب المرگ نے آہ کی چچا زاد بھائی نے اشارہ کیا کہ پہلے انہیں پانی پلاؤ۔ ان کی خدمت میں پانی لے کر حاضر ہوئے، پلانا ہی چاہتے تھے کہ تیسرے کی آہ سنی۔ ان صاحب (جو حضرت ہشام ابن العاصؓ تھے) نے اُسی آدمی کے پاس جانے کا اشارہ کیا۔ پانی لے کر وہاں پہنچے تو وہ اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ واپس پہلے دونوں صحابہؓ کے پاس آئے تو ان کی روحیں بھی پرواز کر چکی تھیں۔ ع

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

کیا انتہا ہے اس ایثار کی کہ آخری گھڑی میں ان اللہ کے پیاروں نے جان، جاں آفریں کے سپرد کر دی لیکن ایثار کے اپنے نشان کو نہ چھوڑا۔ جذبۂ ایثار پیدا کرنے کے لئے ہی اموال میں غریبوں اور مستحق لوگوں کا حق زکوٰۃ، صدقہ، فطرہ اور عشر وغیرہ کی صورت میں متعین کر دیا گیا۔ اور حتی الامکان غریبوں پر ایثار کے لئے آمادہ کیا گیا۔ کیوں کہ ممکن تھا کہ اس طبقے کو سماج میں پس ماندہ، غریب اور کمزور ہونے کی وجہ سے نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا۔ اس کے لئے مختلف قسم کی صورتیں اختیار کی گئیں۔ ایک چھوٹی سی مثال پر غور فرمائیے۔

میوے کے درخت پر جب تک میوہ ظاہر نہ ہو اور آفات سے محفوظ نہ ہو جائے تب تک مالک باغ کو فروخت نہیں کر سکتا۔ ظاہر ہے کہ جب خود فروخت نہیں کر سکتا تو اس کی حفاظت کا انتظام کرے گا تاکہ نقصان سے میوہ محفوظ رہے اور یہ رکھوالی کرنے سے خود قاصر ہے لہٰذا لامحالہ اسے کسی ایسے شخص کو تلاش کرنا ہے جو اس کے باغ کی رکھوالی کر سکے۔ اور یہ رکھوالی ایک غریب شخص ہی کر سکتا ہے۔ اس طرح سے غریب کے لئے روزگار کی صورت پیدا کی گئی۔ یہیں سے وہ الزام بھی دور ہوتا ہے جو اسلام پر سرمایہ داری کی طرف داری کے سلسلے میں لگایا جاتا ہے۔ غریبوں کی رعایت تو اسلام میں اتنی ہے کہ صاحبِ ثروت پر ہی یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ بغیر مطالبے کے مستحقین تک ان کا حق پہنچا دے۔ کسی کے مانگنے کا انتظار نہ کرے۔ اگر کوئی مستحق مل گیا جس نے اس کا صدقہ یا زکوٰۃ قبول کیا۔ تو اس کا احسان مانے کہ اس نے قبول کر کے فریضے کی ادائیگی میں میرا تعاون کیا۔

ذرا غور فرمائیے! کس قدر حکمت اختیار کی گئی ہے۔ ساتھ ہی دورِ حاضر کے اس نظریے پر بھی نظر ڈالئے جو غریبوں کے حقوق کے تحفظ اور ان کو اپنا مقام دلانے کے دعوے کر رہا ہے۔ کہ انہوں نے جو اختیار کیا ہے اس کی وجہ سے سرمایہ دار اور غریب کے درمیان کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہو کر دشمنی پر منتج ہوتی ہے اور باہمی اعتماد

ختم ہوجاتا ہے ۔اسلام کے نقطۂ نظر سے آپ نے دیکھ لیا کہ خود سرمایہ دار، غریب تک ان کا حق پہنچاتا ہے ۔ پھر احسان مند بھی ہوتا ہے ۔ دورِ حاضر میں اگر اسلام کی یہ قدر عام ہوجائے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کی جائے تو کیا رشوت، ڈکیتی، چوری، دھوکہ دہی، حق تلفی اور لوٹ مار کا یہی دور دورہ رہے گا۔ جو آج ہماری نظروں کے سامنے ہے جس کی وجہ سے پوری دنیا بے چینی، بداعتمادی، قتل و غارت گری اور معرکہ اور باہمی لڑائی جھگڑے میں مبتلا ہے ۔

۳۔ مساوات | اسلام کی ایک اہم قدر معاشرتی شعبے کا نظریہ مساوات ہے ۔اسلام کی یہ قدر بھی عظیم جامعیت اور حکمت کی حامل ہے ۔ تمام انسانوں کی مساوات کا اعلان کر کے انسانیت کا سر اونچا کر دیا گیا ۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :۔

لافضل للعربی علی العجمی (الحدیث)

کسی عربی کو عجمی پر فوقیت نہیں ۔

گویا قوم، نسل، رنگ اور ملک کی بنا پر کسی پر فوقیت حاصل نہیں ہاں فضیلت اور شرف کا مدار تقویٰ ہے

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (حجرات پ۲۶)

تم میں سب سے معزز اللہ کے نزدیک وہ ہے جو زیادہ متقی ہو۔

ذات پات، چھوت چھات، قومیت اور رنگ و نسل کے امتیاز کو سرے سے ختم کر دیا ۔اس موقع پر آپ یہ یہ سوال کر سکتے ہیں کہ مسلمانوں میں بھی تو خاندان اور قبائل کا رواج ہے اور اسلام نے بھی ان پر کوئی نکیر نہیں کی، تو عرض کروں گا کہ اس کا جواب خود اللہ تعالیٰ نے دے دیا ہے ۔

جَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا (پ۲۶ حجرات)

کہ ہم نے خاندانوں اور قبائل میں تم کو تقسیم کیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔

خاندانوں اور قبائل کا ہونا فی نفسہٖ ضروری تھا۔ ایک ہی گھر میں جب تین چار مرد موجود ہیں تو ایک دوسرے کو پہچاننے کے لئے نام الگ الگ رکھے جاتے ہیں۔ یہی فرق کے لئے کافی ہے ۔لیکن جب الگ محلے میں پہنچیں گے تو کئی شخصوں کے نام ایک جیسے ہوتے ہیں۔ وہاں پر فرق خاندان کے اعتبار سے ہوگا۔ اور اسی قصبوں اور شہروں کا رخ کریں تو قبائل کا اعتبار ہوگا۔ غرض یہ محض تعارف اور پہچان کا ذریعہ ہیں۔ پھر آپ یہ بھی اعتراض کر سکتے ہیں کہ اسلام نے نکاح میں کفو اور خاندان کا اعتبار کیا ہے ۔کیا یہ مساوات کے منافی نہیں ہے ؟ میں جواباً کہوں گا، وہاں پر کفو کا اعتبار افضلیت کے لئے نہیں کیا گیا بلکہ ازدواجی زندگی کو آسان اور بہتر بنانے کے لئے ایک اہم ضرورت کی تکمیل کی گئی ہے ۔اسی وجہ سے اس کفائت میں صنعت و حرفت، نسب، مہر و نفقہ (مال) اور دیانت کو ہی معتبر مانا گیا۔

غرض مزاج، رہن سہن اور طرزِ زندگی میں یکسانیت اور توافق پیدا کرنے کے لئے کفائت کا اعتبار کیا گیا اگر ایسا نہ ہوتا تو ان کی زندگی تلخ اور اجیرن بن جاتی۔ شریعت نے انسان کی فطرت کے عین مطابق یہ حکم جاری کیا ہے، اگر یہ حکم نہ ہوتا تو حالت ناگفتہ بہ ہوتی۔ اور ایک شادی شدہ جوڑے کو نازک مراحل سے دوچار ہونا پڑتا۔ رہا نفسِ ہنر کا معاملہ۔ تو اسلام نے نفس ہنر کو حقیر نہیں جانا۔ خود صاحب شریعت علیہ السلام نے اپنے جوتے گانٹھے۔ صحابہ کرام بھی تو ڑتے۔ تجارت کرتے۔ محدثین اور مفسرین میں سے آپ کسی کو مٹھائی کا کاروبار کرنے والا، کسی کو عطریات کا اور کسی کو ٹوپی بُننے والا پائیں گے۔ اگر کسی ہنر کی تحقیر کی جاتی تو یہ حضرات خود ان کو اختیار کیوں کرتے۔ اور ایسا الزام کون دے سکتا ہے کیوں کہ اسلام نے اس نومسلم تک کو، جو قبل اسلام اپنے یہاں کسی ادنیٰ سے ادنیٰ خاندان سے رکھتا تھا سینے سے لگایا اس کا اکرام کیا۔ ابتدائے اسلام میں تو یہاں تک حکم تھا کہ غیر مسلم جس مسلمان کے ہاتھ پر اسلام قبول کرتا اسی کے خاندان کا فرد شمار کیا جاتا حتیٰ کہ غلاموں کو، جن کو سوسائٹی میں درندوں اور پالتو جانوروں سے بھی ادنیٰ تصور کیا جاتا تھا، گلے سے لگایا۔ ان کو اس ذلت سے رہائی دلانے کی انتہائی کوشش کی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ایک قسم کھا کر توڑ دیتا ہے تو اس کا کفارہ شریعت میں غلام کو آزاد کرنا ہے۔

فَكَفَّارَتُهُ إِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسَاكِينَ مِنْ أَوْسَطِ مَا تُطْعِمُونَ أَهْلِيكُمْ أَوْ كِسْوَتُهُمْ أَوْ تَحْرِيرُ رَقَبَةٍ (مائدہ پ۷)	اس کا کفارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو کھانا کھلائے، وہ درمیانی کھانا جو تم اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو یا ان کو کپڑا پہنانا ہے۔ یا ایک غلام کو آزاد کرنا (مفہوم)

اسی طرح اگر کوئی ظہار کرتا ہے اور اس سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کفارہ میں سب سے پہلے غلام کو تلاش کرنا ہے۔ تاکہ اس کو آزاد کر کے کفارہ ادا کر سکے۔

وَالَّذِينَ يُظَاهِرُونَ مِنْ نِسَائِهِمْ ثُمَّ يَعُودُونَ لِمَا قَالُوا فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَتَمَاسَّا ط (مجادلہ پ۲۸)	اور جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں پھر اپنے کہے کو توڑتے ہیں تو قبل اس کے ایک غلام کو آزاد کرنا ہوگا۔ (مفہوم)

اگر کوئی روزہ رکھ کر توڑ دیتا ہے تو اس کا بھی کفارہ یہی ہے۔ غلام آزاد کرے۔ چنانچہ اسلام کی بدولت دنیا کا ٹھکرایا ہوا یہ طبقہ سلطنتوں پر بھی قابض ہوگیا۔ بڑے بڑے محدث، مفکر اور علماء ان میں پیدا ہوئے۔ خلیفہ عبدالملک ایک مرتبہ حج کے لئے گئے۔ اس وقت کے مایہ ناز علماء میں سے امام زہریؒ تھے۔

ان سے ملاقات ہوئی۔ دورانِ گفتگو عبدالملک نے سوال کیا کہ مکہ شریف میں اس وقت سب سے بڑے عالم کون ہیں؟ امام زہری نے موالی میں سے کسی کا نام بتایا۔ خلیفہ نے پوچھا۔ مدینہ منورہ ہے۔ تو جواب میں یہاں بھی کسی موالی کا نام بتایا۔ غرض تمام مشہور جگہوں کے بارے میں یہی جواب ملا۔ کہ وہاں کے امام وقت فلاں شخص ہیں جو (موالی) غلاموں میں سے ہیں۔

عبدالملک نے جب پوچھا کہ کوفہ میں کون ہے؟ تو امام زہری نے فرمایا کہ وہاں پر امام ابراہیم نخعی ہیں۔ پوچھا، یہ کس خاندان سے ہیں؟ جواب ملا قریش سے۔ بادشاہ نے ذرا سانس لیا اور کہا کہ میں تو سمجھنے لگا تھا کہ اب تو اس شرف سے موالی ہی مشرف ہیں۔ یہاں پر اس اشکال کا دور کرنا بھی ضروری ہے جو آپ حضرات کے ذہنوں میں اٹھ رہا ہو گا کہ مرد اور عورت کے تعلقات کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر شاید مساوات کے منافی ہے کیونکہ قرآن نے اعلان کیا ہے۔

الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ (نساء ۵) مردوں کو عورتوں پر فوقیت حاصل ہے۔

لیکن مرد اور عورت کے بارے میں اسلام نے جو حد بندیاں کی ہیں وہ مساوات کے منافی نہیں۔ بلکہ عین انصاف اور مساوات پر مبنی ہیں۔ ورنہ معاشرے میں عجیب قسم کی مطلق العنانیت پیدا ہو جاتی۔ نیز اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے ہمیں ذرا مڑ کر دیکھنا ہو گا۔ کہ عام تہذیبوں اور مذاہب نے عورت کو کیا مقام دیا تھا اور اسلام نے اس بارے میں کیا حکم دیا۔

قدیم زمانے میں عورت کی حیثیت یہ تھی کہ اسے جوئے میں بلا تکلف ہرا دیا جاتا۔ شراب کے چند گھونٹوں کے لئے بطور معاوضہ عورت کی خرید و فروخت ایک سہل ترین تدبیر تھی۔ بلکہ عورت اس رنگ و بو میں ایک ایسی غلیظ چیز تھی جسے بے محابہ زندہ درگور کیا جاتا رہا۔ اس کو طفل نابالغ اور باندیوں کا درجہ دیا جاتا تھا اسلام کے نظریات پر توجہ کیجئے۔ اسلام نے عورت کے مقام کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:-

"میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔ یا عورت میں۔"

حضرت عائشہؓ پر تہمت لگائی گئی تو ان کے دفاع کے لئے قرآن کریم میں سورت نازل ہوئی۔ نیز اس عورت کا واقعہ مشہور ہے جس کی شکایت پر پوری سورت مجادلہ نازل ہوئی۔ معصوم بچیوں کے قتل ناحق کو حرام قرار دیا گیا۔ ان کو عزت اور احترام کے ساتھ قیمتی سرمائے کی طرح پردے اور حفاظت میں رکھنے کی تاکید کی گئی۔ ان کو مرد کا زرخرید محکوم نہیں بلکہ مشیر رفیقہ حیات اور وزیر کا درجہ دیا گیا۔ یہ ہے عورت کی عزت، عظمت اسلام میں کہ خود خدائے کائنات ان کی معمولی گذارشات پر بھی اپنی رحمتوں

کے ساتھ متوجہ ہیں۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ اسلام ہی نے صنفِ نازک کو خاک سے طاق پر پہنچا دیا جب کہ اس صنفِ نازک کو دنیا کی قوموں نے بلندیوں سے پستیوں کی طرف دھکیل دیا تھا۔ بیوہ کے حق کو آج کوئی تسلیم کرنے کو تیار نہیں بلکہ بعض قومیں بیوگی کو نحوست تصور کرتی ہیں۔ اسلام نے بیوہ کے ساتھ نکاح کو پسندیدہ قرار دیا۔ حضورؐ کی تمام ازدواج بیوہ تھیں۔ سوائے ایک کے۔

اسلام نے عورتوں کے ساتھ ایسا مشفقانہ برتاؤ کیا، ان کو اس منزل پر لا بٹھایا جس کی نظیر نہیں ملتی۔ اسلام کی چند اقدار کو نمونے کے طور پر آپ کے سامنے اجمالی طور پر پیش کیا گیا۔ اور اس ضمن میں کچھ جزئیات بھی آپ کے سامنے آئیں۔ یہ اقدار ہر زمانے میں رہی ہیں۔ اور رہتی آئی ہیں۔ آج کل بھی ان کا وجود ہے لیکن کم۔ اسی وجہ سے آج کی دنیا بے چین ہے۔ پوری انسانیت آج اطمینان اور سکون کی متلاشی ہے۔ سکھ کے لئے سرگرداں اور حیران و پریشان ہے۔ کبھی اس مقصد کے حصول کے لئے بین الاقوامی و ملکی اور ملی سطحوں پر کانفرنسیں ہو رہی ہیں، کہیں کونسلیں بنائی جا رہی ہیں اور کہیں مشاورتیں ہو رہی ہیں۔ لیکن میں اتنا عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ مسائل نہ کانفرنسوں سے حل ہوں گے۔ نہ ظاہری معاہدوں سے بات بنے گی نہ مشاورتوں سے کوئی نتیجہ برآمد ہوگا۔ بلکہ اگر دنیا کو چین اور سکون کی ضرورت ہے۔ گورے اور کالے کے اختلافات کو حل کرنا ہے ملکی اور غیر ملکی نزاع کو رفع کرنا ہے۔ ذات پات، چھوت چھات کے فرق کو مٹانا ہے۔ تو اس کی صرف ایک ہی صورت ہے اور یہ نسخہ کوئی نیا نہیں۔ بلکہ آزمودہ اور مجرب ہے۔ اور اس کے سوا دوسرا کوئی راستہ بھی نہیں کہ ان اسلامی اقدار کو اپنی اصلی صورت اور طرز کے ساتھ عام کیا جائے۔ اور ان کو اپنایا جائے۔ اب سے ہزار سال پہلے کے حالات کا آپ اندازہ لگائیں جب معاملات بھی محدود تھے، مواصلات بھی محدود، تعارف بھی محدود۔ ہر خطہ اور ہر بستی کی اپنی ایک الگ دنیا تھی۔ اس ماحول میں جب ان اقدار کو اپنایا گیا تو دنیا نے دیکھ لیا۔ اور ہم آپ سب جانتے ہیں کہ پوری دنیا نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور امن و چین کی زندگی نصیب ہوئی۔ آج جب کہ مشرق و مغرب کا راستہ قریب سے قریب تر ہو چکا ہے۔ ہزاروں مہینوں کی مسافت طے کرنے کے لئے چند منٹ یا گھنٹے صرف ہوتے ہیں پوری دنیا مثل ایک گھر کے ہو گئی ہے۔ ایسے حالات میں ان اقدار کو زیادہ اپنانے کی ضرورت ہے اور زیادہ سے زیادہ ان پر عمل پیرا ہونے کی حاجت ہے تاکہ پوری دنیا اطمینان اور آشتی کا گہوارہ بن جائے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ ان اقدار کو ان کی اصلی حالت پر بغیر کسی ترمیم اور تغیر و تبدل کے اپنایا جائے کیونکہ یہ خود ہی کامل اور مکمل ہیں۔ اسلام کی وہ انسانی اقدار ہیں جن میں کسی مذہب فرقے یا قوم کا اختلاف تقریباً نہیں ہے۔ نہ ہی ان میں اجتہاد و تجدید کی ضرورت ہے اور نہ ہی قدامت و تجدد کا سوال ہے۔ ان امور کو اپنی زندگی میں نافذ کرنے کے سلسلے میں حسب ذیل

صورتیں اختیار کی جاسکتی ہیں۔

۱۔ مدرسوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب میں اخلاقی تعلیم کو رائج کرانے کی کوششیں کی جائیں۔

۲۔ پاکستان اور آزاد کشمیر میں تعلیم بالغاں (Adult Education) کا جو پروگرام چل رہا ہے اس میں بھی اس تعلیم کا انتظام کر دیا جائے۔

۳۔ ذرائع ابلاغ اور نشر و اشاعت میں ان چیزوں کو مؤثر اور مثبت پیرائے میں عوام کو سمجھانے کی کوشش کی جائے۔

۴۔ سرکاری و غیر سرکاری تمام تعلیمی اداروں میں ہر مذہب کے طلبا کے لئے ان کے مذہب کے مطابق ایک، ایک مستند و معتبر عالم کا تقرر کیا جائے۔ جو ان کو مذہبی طور پر بھی ان کی جانب مائل کرے۔

۵۔ ہر قصبہ یا محلے میں ایک ایک انجمن یا کمیٹی قائم ہو۔ جس میں وہاں کے علماء اور حکماء کے علاوہ مقامی ذمہ داران کو شامل کیا جائے۔ تاکہ ان امور کے نفاذ میں دشواری نہ ہو۔ اور ان کمیٹیوں یا انجمنوں کی ضلعی، صوبائی اور قومی سطح پر ایک مرکزیت ہو۔ جو کم از کم ہر ماہ ان انجمنوں اور عام معاشرے کے عملی کام کا جائزہ لیا کرے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

بقیہ: حضرت اخوند درویزہ

اصلی کتاب بہت نایاب ہے۔ آج کل یہ کتاب دو یا تین قلمی کتاب خانوں میں موجود ہے جس کا فارسی ترجمہ و تشریح خود اخوند درویزہ نے فرمایا ہے۔ مگر ان اشعار کا پشتو ترجمہ جید عالم دین مولوی روح اللہ الحسینی الحنفی مدظلہ ساکن ماہزارہ تحصیل پارسرہ نے بھی کیا ہے۔ اور یہ پشتو ترجمہ و تشریح اسلامی کتب خانہ بازار قصہ خوانی پشاور شہر نے شائع کیا ہے۔

بہرحال حضرت اخوند درویزہ پشتو زبان کی نثر فنی یعنی مقفی اور مسجع عبارت کی ترقی دینے والوں میں سے ہیں۔ آپ ایک خاص طرز کے بانی ہیں اور بایزید انصاری کے پیروؤں میں بھی ان کی طرز نگارش نے رواج پایا ہے لہٰذا پشتو ادب کی تاریخ میں وہ خود ان کے شاگرد اور ان کا خاندان اہمیت کا حامل ہے۔

حضرت اخوند درویزہ نے اپنی تالیفات سے عوام الناس کو فائدہ پہنچایا اور اب بھی لوگ ان کی کتابوں سے فیض حاصل کرتے ہیں۔ پشتو کے ایک مشہور شاعر حافظ الپوری المتوفی (۱۲۱۵ھ) نے اس کا اظہار یوں فرمایا ہے

پښتونستہ د دین لار اخوند دنرا کړه   مردوزن دي په ځان بار د منت زدي

ڈاکٹر ظفر الاسلام صاحب

عبّاسی دَور کی انفرادی بنک کاری پر ایک نظر

عباسی عہد خلافت تہذیب وتمدن کے فروغ، علوم وفنون کی اشاعت اور انتظامی واقتصادی اداروں کی توسیع وترقی کے لئے معروف ہے۔ انفرادی بنک کاری کو ان اقتصادی اداروں میں ایک خاص مقام حاصل ہے جنہیں اس دَور میں ترقی ملی، اسلامی بنکنگ کے نشوونما میں ادارہ بیت المال کو جو اہمیت حاصل ہے اس سے قطع نظر (جو ایک مستقل مضمون کا طالب ہے) انفرادی بنک کاری کی سرگرمیوں کو جن میں تاجر اور صراف کلیدی رول ادا کرتے تھے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ عباسی دور کی انفرادی بنک کاری (جس میں یہودی وعیسائی تاجروں وصرافوں کو زیادہ دخل تھا) اسلام کے اپنے بنکنگ نظام سے پورے طور پر میل نہیں کھاتی۔ لیکن فی نفسہ بنکنگ نظام کو وسعت وترقی دینے میں اس بنک کاری کی جو خدمات ہیں وہ اپنی جگہ پر مسلم اور لائق توجہ ہیں۔ یہ کہنا شاید مبالغہ آرائی ہوگا کہ اس وقت انفرادی بنک کاروں نے عہد جدید کے طرز پر باقاعدہ کوئی بنکنگ نظام تشکیل دیا تھا۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ معاصر حالات کی مناسبت سے وہ قریب قریب وہی امور انجام دے رہے تھے۔ جو اس دَور میں بنک یا بنکنگ اداروں کے ذریعہ پایۂ تکمیل کو پہنچتے ہیں۔ اس لئے ان کا دائرہ کار کا جائزہ لینا اور ان کی بنکنگ خدمات پر روشنی ڈالنا اہمیت اور دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

عباسی دور کی ابتدا میں انفرادی بنک کاری کا دائرۂ عمل سکوں کی تشخیص، ان کی قیمت کا تعین اور ان کے تبادلہ تک محدود تھا۔ مختلف النوع سکوں کے چلن اور ان کے شرح تبادلہ میں اختلاف[1] کی وجہ سے ان لوگوں کی سرگرمیوں میں لازماً اضافہ ہوا۔ جو سکوں کی تشخیص وتعین اور ان کے تبادلہ کے عمل میں مہارت

رکھتے تھے۔ یہ ماہرین نقود اصلاً تجارتی طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اور ان کے لئے صراف، ناقد و جہبند کی اصطلاحیں[۱]
رائج تھیں۔ سکوں کی مہارت رکھنے والا یہ طبقہ خالص عباسی دور کی پیداوار نہ تھا۔ لیکن اس دور میں انتظامی
تبدیلیوں اور عوام کی ضروریات نے ان کے کاموں کو وسعت بخشی اور ان کی قدر و قیمت کو بڑھا دیا۔ یہاں تک
کہ سکوں کی چھان بین اور ان کے تبادلہ سے آگے بڑھ کر رقوم جمع کرنا، قرض فراہم کرنا اور ایک مقام سے
دوسرے مقام کو نقود منتقل کرنا ان کی مصروفیات کے مختلف اجزاء بن گئے۔ اس طرح اس طبقہ کے دائرہ کار میں
وہ امور بھی شامل ہو گئے جنہیں بجا طور پر بنکنگ اعمال کے مترادف قرار دیا جا سکتا ہے۔ اور جن کے انجام دینے
والوں کے لئے بنک کی اصطلاح استعمال کرنا بھی غلط نہ ہوگا۔

عباسی دور میں انفرادی بنک کار کے مفہوم میں جس اصطلاح کو سب سے زیادہ رواج ملا وہ "جہبند"
(جمع جہابذہ) ہے۔ یہ فارسی لفظ "کہبند" کا معرب ہے جس کے معنی ہیں کھرے و کھوٹے سکوں میں تمیز کرنے والا
یا سکوں کی تشخیص و تعیین قیمت کی مہارت رکھنے والا۔[۲] ساسانی دور حکومت میں کہبند شعبہ خراج کے انچارج یا
سکرٹری کی حیثیت سے مقرر کئے جاتے تھے۔[۳]

امیہ دور میں محاصل کے شعبہ میں جہبند کی تقرری کی بعض مثالیں ملتی ہیں۔[۴]

عباسی خلافت کے دوران صوبائی حکومت خراج کی تحصیل میں ان سے مدد لیتی تھی۔ اور زوال کے زمانہ میں
جب ایک متعین اور یکمشت رقم کے عوض ٹھیکہ پر خراج کی وصول یابی کا طریقہ رائج ہوا تو حکومت نے ان سے
اس طریقہ کے تحت تحصیل خراج کا سمجھوتہ کرنا شروع کیا۔[۵] ان سب کے ساتھ عباسی عہد میں جہابذ انفرادی بنک کار
کی حیثیت سے زیادہ نمایاں ہوئے جیسا کہ آنے والی تفصیلات سے واضح ہوگا۔

عباسی دور کی انفرادی بنک کاری تین اہم خانوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔
(ا) لوگوں کی رقمیں جمع کرنا (ب) قرض کے طور پر مالی فنڈ فراہم کرنا (ج) ایک مقام سے دوسرے مقام
ارسال زر کا اہتمام کرنا۔ ہمارے روایتی مآخذ میں جو بالعموم حکومت اور اہل حکومت سے متعلق واقعات پر روشنی

---

۱ مجدالدین شیرازی، القاموس المحیط، دمشق، ۱۹۵۴ء، جلد اول ص ۲۶۹، محمد مرتضیٰ الزبیدی، تاج العروس
بیروت ۱۹۶۲ء، المجلد الثانی ص ۵۵۵، سعید الخوری، الشرتونی، اقرب الموارد بیروت ۱۸۸۹ء، الجزء الاول ص ۱۴۲
۲ ابن رستہ، الاعلاق النفیسہ، لیدن ۱۸۹۲ء، ص ۱۹۶ ۳ محمد بن عبدوس الجہشیاری، کتاب الوزراء والکتاب
قاہرہ ۱۹۳۸ء ص ۱ ۴ الصابی ص ۱۹۲، ۱۹۸، الجہشیاری ص ۱۷۹، القمی، تاریخ قم، تہران ۱۳۵۳ھ ص ۱۴۹، عبدالعزیز
دوری، تاریخ العراق الاقتصادی فی القرن الرابع الہجری بغداد ۱۹۴۸ء، ص ۱۶۱، ۱۶۹

ڈالتے ہیں۔ عام اصحابِ ثروت کی جانب سے جہبذ یا انفرادی بنک کاروں کے پاس نقد رقوم جمع کرنے کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ لیکن ان میں اس کے کافی شواہد موجود ہیں کہ عام تحفظ کے نقطۂ نظر سے یا حکومت کے ضبطِ اموال کے قانون (مصادرہ)[1] سے بچنے کے لئے وزراء، گورنر اور دوسرے اہم افسرانِ حکومت انفرادی بنک کاروں کے یہاں اپنے نقود جمع کراتے تھے۔ ابتداءً یہ اہلِ حکومت اپنی ضروریات کے لئے بالتخصیص بنک کاروں کی خدمات حاصل کرتے تھے۔ جیساکہ جہشیاری کے بیان سے یہ شہادت ملتی ہے کہ منصور کے وزیر خالد برمکی ایک نصرانی جہبذ کے پاس اپنی رقمیں جمع کرتے تھے[2]۔

اسی ماخذ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ عمر بن مہران (جو ہارون الرشید کے دور میں مصر کے عامل تھے) کے ایک جہبذ تھے جو ان کی نقد رقوم کا حساب رکھتے تھے[3]۔ لیکن بعد کے دور میں رقوم کے جمع و تحفظ کی ضروریات نے اس قدر اہمیت اختیار کر لی کہ وزراء و گورنر اور دوسرے اہم افسران ذاتی طور پر اپنے خاص بنک (ناقد یا جہبذ) متعین کرنے لگے۔ اہم بات یہ کہ ماخذ میں کچھ وزیروں کے مخصوص بنکوں کے نام بھی ملتے ہیں۔ ان کا ذکر یہاں دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

سلیمان بن وہب۔ بیت[4]، ابن الفرات۔ ہارون بن عمران و یوسف بن فنحاس[5]۔ حامد بن العباس۔ ابراہیم بن یوحنا[6]۔ علی ابن عیسیٰ۔ ابن ابی عیسیٰ۔ ابن بشیر زاد[7]۔ علی بن ہارون۔ ابو عبداللہ البریدی (گورنر اہواز) یعقوب اسرائیل بن صالح اور سہل بن نذیر[8]۔ مذکورہ وزراء میں اول الذکر معتمد کے دور (۸۷۰-۸۹۲) اور بقیہ مقتدر کے زمانہ (۹۰۸-۹۳۲) سے تعلق رکھتے ہیں۔ وزراء اپنے مخصوص بنکوں کے پاس پوشیدہ طور پر رقمیں جمع کرتے تھے۔ اور حسبِ ضرورت نقداً یا چک و رقعہ کے ذریعہ ان سے رقوم حاصل کرتے تھے۔ اس طریقہ کے استعمال کرنے سے نہ صرف یہ کہ اہلِ مناصب کی دولت محفوظ ہو جاتی تھی بلکہ اس سے انفرادی بنک کاروں کو یہ موقع بھی فراہم ہوتا تھا کہ وہ

---

[1] عباسی دور میں جب کوئی وزیر یا اہم افسر کسی جرم میں ماخوذ ہوتا یا کسی بدعنوانی میں ملوث پایا جاتا تو معزولی کے ساتھ ساتھ اس کا نقدی مال بھی ضبط کر لیا جاتا تھا۔ اسے مالی جرمانہ سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ اور اس کے لئے مصادرہ کی اصطلاح رائج تھی۔ (ہلال الصابی، تحفۃ الامراء فی کتاب الوزراء، دمشق ۱۹۵۸ء، ص ۹۰، ۱۴۰، ۱۴۱، ۲۳۶، ۲۳۷، ۱۷۲ای الشیر محولا بالا ص ۱۱۴، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۴۱، ۱۷۲ [2] الجہشیاری ص ۶۷ [3] ایضاً ۱۷۴ [4] ابو علی محسن التنوخی نشوار المحاضرہ و اخبار المذاکرہ دمشق ۱۹۳۰ء۔ الجزء الثامن ص ۵۶ [5] الصابی ص ۹۰، ۹۱، ۳۲۲ تنوخی، محولا بالا [6] الصابی ۲۴۸ مسکویہ، تجارب الامم آکسفورڈ ۱۹۲۰ء جلد اول ص ۹۵ [7] الصابی ص ۲۴۵، ۳۱۶ [8] مسکویہ جلد ۲ ص ۸ [9] ایضاً جلد اول ص ۱۵۸، ۳۴۹ جلد دوم ص ۵۲۔

جمع شدہ رقم کو اپنے بنکنگ اعمال کو وسعت دینے میں استعمال کریں۔ اس ذریعہ سے ان کے پاس کس کثیر مقدار میں مالی فنڈ اکٹھا ہو جاتا تھا اس کا اندازہ چند مثالوں سے ہو سکتا ہے۔

سلیمان وہب کی معزولی کے بعد ان کے بنکر لیث کے پاس ان کی جمع کردہ رقم جو برآمد ہوئی وہ قریباً ۸۰ ہزار دینار تھی[1] ابن الفرات کی تمام احتیاط کے باوجود حکومت ان کی جمع کردہ رقم کا پتہ لگانے میں کامیاب ہو گئی اور یہ رقم ایک لاکھ ساٹھ ہزار دینار کے برابر تھی[2]

اسی طرح حکومت نے حامد بن العباس کے بنک سے ان کی معزولی کے بعد جو رقم حاصل کی وہ ایک لاکھ دینار تھی[3] اس کے علاوہ جمع کی جانے والی رقموں کی کثیر مقدار اس سے بھی واضح ہوتی ہے کہ بعض وزیر اور گورنر دو، دو، تین تین بنکر رکھتے تھے۔ مزید برآں یہ امر کہ یہ جہابذہ نہ صرف روپیہ جمع کرنے والے تھے بلکہ باقاعدہ بنکر کے فرائض انجام دیتے تھے۔ اس سے بخوبی واضح ہوتا ہے۔ کہ وزیروں کی آمدنی براہِ راست ان کے پاس وصول ہو جاتی تھی[4] اور یہ وزراء خود دوسروں کو مالی اعانت بہم پہنچانے کے لئے پالیسی اور مقصد کے تحت اپنے پاس سے رقوم کی ادائیگی کے بجائے اپنے بنک کے نام چک جاری کرتے تھے[5] یہ بنکر متعلقہ وزیر کے جمع اور خرچ کا باقاعدہ حساب رکھتے تھے۔ اور مالی فنڈ کے منتظم یا محاسب کی خدمات بھی انجام دیتے تھے[6]

عباسی دور میں انفرادی بنک کاری کا دوسرا اہم پہلو قرض کے طور پر مالی فنڈ کی فراہمی تھی۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ جہابذہ کے دیگر ذرائع آمدنی کے علاوہ دوسروں کی جمع کردہ نقد رقوم اس بنکنگ عمل کے لئے محرک اور اسے وسعت دینے میں مدد و معاون ثابت ہوئیں۔ معاصر مورخین کے بیانات سے یہ ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ زوال کے دور میں جب عباسی حکومت معاشی بحران کا شکار ہوئی تو اس نے اس پر قابو پانے کے لئے مختلف تدابیر اختیار کیں مثلاً ریونیو فارمنگ (ایک متعین پیشگی رقم کے عوض محاصل کی وصولیابی کے لئے سمجھوتہ کرنا) خالصہ زمینوں کی فروخت، نئے شعبوں کا قیام اور ان کی نیلامی وغیرہ[7]

اس کے علاوہ بعض تجربہ کار وزیروں نے آمد و خرچ میں توازن پیدا کرنے کے لئے اخراجات میں تخفیف ۔۔

---

[1] تنوخی، الجزء الثانی صہ ۷۵، دوری صہ ۱۶۳ [2] الصابی صہ ۹۰، ۹۱، ۱۴۰، ۱۴۱، مسکویہ جلد ا صہ ۱۲۸، تنوخی محولہ بالا صہ ۲۲، ۲۳۔ [3] الصابی صہ ۲۸۴ مسکویہ جلد ا صہ ۹۵۔ ان تفصیلات سے ایک دلچسپ پہلو یہ سامنے آتا ہے کہ وزراء اور دوسرے افسران کی تمام احتیاطی تدابیر کے باوجود حکومت اکثر ان کے خفیہ اکاؤنٹ کا پتہ لگانے اور جمع کردہ رقم کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی تھی [4] الصابی صہ ۳۵ [5] ایضاً صہ ۲۳۲ مسکویہ جلد اول صہ ۱۲ [6] الجہشیاری صہ ۱۷۴

[7] الشیرم صہ ۱۳۴ تا ۱۳۶

اور عملۂ حکومت کی تنخواہ میں کمی وغیرہ جیسے طریقے اپنائے۔ ان سب کے باوجود حکومت کے اپنے وسائل ہنگامی ضروریات اور فوجی اخراجات کی تکمیل کے لئے کافی نہ ہوتے۔ تو مالی فنڈ کی فراہمی کے لیے انفرادی بنک کاروں کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں۔ عبدالعزیز دوری کے خیال میں عباسی حکومت نے مقتدر کے زمانہ سے انفرادی بنک کاروں کا سہارا لینا شروع کیا۔ اس سے قبل وہ مزید وسائل کی فراہمی کے لئے دوسرے ذرائع اختیار کرتی تھی۔[1]

اس بیان کی توثیق مذکورہ خلیفہ کے دورِ حکومت میں مالی فنڈ کی فراہمی کے لئے وزراء و جہابذ کے درمیان متعدد سمجھوتوں سے ہوتا ہے۔ مزید برآں اس دور میں حکومت کے لئے بنک کاروں کی خدمات کی اہمیت اس بات سے بھی واضح ہوتی ہے کہ اس نے اپنے مخصوص بنکر مقرر کئے۔ جو "جہابذ الحضرۃ" کے لقب سے معروف ہوئے اور انہیں دربار میں مختلف قسم کی آسانیاں و مراعات بہم پہنچائیں۔[2]

ان درباری یا سرکاری بنک کاروں میں ہارون بن عمران اور یوسف بن فنحاس کا نام ماخذ میں بار بار آتا ہے۔[3]

اور عہد مقتدر کے مختلف وزراء (جو انتظامیہ کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے آمد و خرچ میں توازن پیدا کرنے کے خاص ذمہ دار ہوتے تھے) اور ان بنک کاروں کے مابین قرض کے متعدد معاملات طے ہونے کے حوالے ملتے ہیں۔

مقتدر کے مشہور وزیر ابن الفرات کے بارے میں مختلف ماخذ سے یہ ثابت ہے کہ انہوں نے اپنی پہلی وزارت کے دوران (۹۰۸ - ۹۱۱) یہودی جہبذ یوسف بن فنحاس سے یہ معاملہ کیا وہ انہیں اس مقدار میں نقود فراہم کرے۔ کہ وہ اہواز کے عملۂ حکومت کی دو ماہ کی تنخواہ ادا کر سکے۔ وزیر نے ضمانت یا سیکورٹی کے طور پر صوبہ اہواز کے آئندہ محاصل کو پیش کیا۔ جس کی وصولی کا حق انہیں حکومت سے سمجھوتہ کے تحت حاصل کیا تھا۔[4] یہ ایک وقتی ضرورت کے تحت درباری بنکر کی جانب سے حکومت کو قرض فراہم کرنے کی مثال تھی۔ جس میں مقروضہ رقوم کی صراحت نہیں ملتی رقم کی وضاحت کے ساتھ طویل المیعاد قرض کی مثال وزیر علی ابن عیسیٰ اور درباری بنک کاروں کے درمیان ایک معاہدہ میں ملتی ہے جو اس کی پہلی وزارت (۹۱۲-۹۱۶) کے دوران مکمل ہوا۔ وزیر نے جب حکومت کے خزانہ

---

[1] تاریخ العراق الاقتصادی محولہ بالا ص ۱۶۳ [2] الصابی ص ۹۰، ۹۱، ۱۷۷ [3] الصابی ۹۰، ۹۳، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۷۷، تنوخی، نشوار المحاضرہ، الجزء الثانی ص ۸۱ - ۸۴ - ۸۵ مسکویہ جلد اول ص ۴۴، ۶۶، ۷۹، ۸۰
[4] الصابی ص ۱۹۸

سے فوج کو تنخواہ ادا کرنے میں دشواری محسوس کی تو ہارون بن عمران اور یوسف بن فنحاس سے یہ معاملہ طے کیا کہ وہ دونوں حکومت کو ہر مہینہ ایک لاکھ پچاس ہزار دینار مہیا کریں۔ جو انہیں بعد میں صوبہ اہواز کے محاصل سے واپس مل جائے گا۔[1]

یہ سمجھوتہ بظاہر ایک طویل مدت کے لئے معلوم ہوتا ہے لیکن اس سے صاف طور پر یہ نہیں پتہ چلتا کہ کب تک یہ باقی رہا۔ لیکن اسی وزیر نے حکومت کو ہر مہینے دس ہزار دینار فراہمی کے لئے انہیں بنک کاروں سے ایک دوسرا سمجھوتہ کیا۔ ماخذ کی تصریح کے مطابق اس کی میعاد ۱۶ سال تھی۔ اور اس قرض کے لئے حکومت نے ان سفتجات (LTTERS OF CREDIT) کی ضمانت دی جو صوبوں سے وصول ہوئے تھے۔ لیکن ان کے عوض نقد حاصل کرنے کی مدت ابھی پوری نہیں ہوئی تھی۔[2]

درباری بنک کاری کی جانب سے حکومت کو قرض فراہم کرنے کی ان چند مثالوں سے جو اہم باتیں سامنے آتی ہیں وہ یہ کہ جدید دور کی مثل اس وقت بھی قرض کے حصول کے لئے سیکوریٹی یا ضمانت کا طریقہ رائج تھا اور وقتی ضرورت کے علاوہ طویل مدت کے لئے بھی قرض کے معاملے طے کئے جاتے تھے۔

جمع رقوم اور فراہمی قرض کے علاوہ ایک مقام سے دوسرے مقام کو رقوم کی منتقلی یا ارسال زر بھی انفرادی بنک کاروں کے دائرہ عمل میں شامل تھا۔ خطرات سفر اور بار تحمل سے بچنے کے لئے تاجروں کے ذریعہ ایک شہر سے دوسرے شہر نقد رقوم بھیجنے کا طریقہ مسلم ممالک میں پہلی صدی ہجری ہی سے رائج تھا۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ (وفات ۶۸ھ) اور عبداللہ ابن زبیر (وفات ۷۳ھ) کی بابت روایتوں سے یہ ثابت ہے کہ وہ مکہ میں مسافروں اور تاجروں کی نقد رقوم جمع کر لیتے تھے اور کوفہ و بصرہ میں (جہاں وہ اپنی رقوم بھیجنا چاہتے تھے) ان کی ادائیگی کے لئے اپنے شرکاء تجارت یا نمائندوں کے نام خط لکھ دیا کرتے تھے۔[3]

بعد کے دور میں ارسال زر کے اس سادہ سے طریقہ نے اور ترقی کی اور عام تاجروں کے بجائے ان کا ایک مخصوص طبقہ یا انفرادی بنک کار اسے قابل عمل بنانے اور آگے بڑھانے میں مصروف ہوئے۔ اس کے کچھ اصول و ضوابط بنائے گئے اور اس کے لئے سفتجہ[4] کی خاص اصطلاح رائج ہوئی جو بالعموم بل آف ایکسچینج یا لیٹر آف

---

[1] الصابی ص ۹۲، تنوخی، نشوار المحاضرہ، الجزء الثامن ص ۲۳، ۲۴ [2] الصابی، تنوخی ص ۲۵، ۲۶ [3] محمد بن احمد السرخسی، المبسوط، مطبعۃ السعادۃ القاہرہ۔ الجزء الرابع عشر ۳۶، ۳۷ ڈاکٹر صالح احمد العلی التنظیمات الاجتماعیۃ والاقتصادیۃ فی البصرہ فی القرن الاول من الہجری بغداد ۱۹۵۳ء ص ۲۶۴ [4] سفتجہ (جمع سفاتج) فارسی کا لفظ سفتہ کا معرب ہے۔ اس کے لفظی معنی محکم و مضبوط شئی کے ہیں۔ اصطلاحی طور پر یہ ایک متعین رقم کی (باقی اگلے صفحہ پر)

کریڈٹ کے ہم معنی قرار دیا جاتا ہے۔ اگرچہ سفتجہ کے طریقہ سے واقفیت اور اس پر عمل آوری عہد عباسی سے پہلے موجود تھی[1] لیکن مسافروں، تاجروں و اہل حکومت میں اس کی مقبولیت اور اس کے استعمال کی وسعت عباسی دور کی مرہون منت ہے۔ ارسال زر کے اس طریقہ کے تحت معمول یہ تھا کہ ایک مقام سے دوسرے مقام ارسال زر کے طلب گار مقامی بنک کار کے پاس اپنی رقوم جمع کر دیتے تھے۔ یہ بنک کار جمع کرنے والے کے مطلوبہ شہر میں اپنے یا اس کے نامزد شخص کو ادائیگی کے لئے تحریری ہدایت یا حکم نامہ (سفتجہ) جاری کرتا تھا۔ اسے ہم جدید دور کی اصطلاح میں ٹریولنگ چیک، بنک ڈرافٹ یا پوسٹل آرڈر سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس دور کے تاریخی و ادبی لٹریچر میں سفتجہ کی جو تفصیلات ملتی ہیں ان سے بخوبی اس کے استعمال کی نوعیت اور انفرادی بنک کاری کی وسعت واضح ہوتی ہے۔

دسویں صدی عیسوی کے واقعات پر روشنی ڈالتے ہوئے محسن تنوخی نے ایک مسافر کا ذکر کیا کہ مشرق سے اسپین طویل سفر کے دوران اس کے پاس کچھ نقد تھا اور باقی پانچ ہزار دینار سفتجہ یا بل آف ایکس چینج کی صورت میں تھا[2]۔ اسی ماخذ میں ایک عورت کا قصہ مذکور ہے کہ اس نے اپنے شوہر سے (جو کسی دور دراز علاقے میں رہتا تھا) سفتجہ کے ذریعہ دو سو دینار وصول کئے[3]۔

بصرہ میں تجارت کے ایک اہم مرکز دارالزبیر سے منسلک ایک تاجر کا اپنا تجربہ مذکورہ مؤلف کی ایک دوسری کتاب میں منقول ہے کہ وہاں پہنچنے کے بعد ایک مسافر نے اپنے سفتجہ کا غذات اس کے پاس جمع کئے اور اس

بقیہ ص۴۸ ایک طے شدہ مقام پر ادائیگی کے لئے حکم نامہ یا ہدایت نامہ کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ جو ایک شخص کی جانب سے دوسرے کے لئے جاری کیا جائے۔ مزید لغوی وضاحت کے لئے ملاحظہ کیجئے عبد الرشید فرہنگ رشیدی کلکتہ ۱۸۷۵ء جلد دوم ص ۲۴۔ القاموس المحیط، محولہ بالا ص ۱۹۴۔ اقرب الموارد، محولہ بالا الجزء الاول ص ۱۹۵ محمد اعلیٰ تھانوی، کشاف اصطلاحات الفنون۔ کلکتہ لیتھو پریس ۶۳۶-۶۳۷

[1] سفتجہ کی بابت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث منسوب ہے لیکن ناقدین حدیث نے عموماً سے ضعیف قرار دیا ہے اور ابن الجوزی نے اسے موضوعات میں شمار کیا ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے جمال الدین ابو محمد عبد اللہ الزیلعی نصب الرایہ لاحادیث الہدایہ، المجلس العلمی، سورت ۱۹۳۸ء ص ۶۰۔ ڈاکٹر صالح احمد العلی کے خیال میں اس کا چلن پہلی صدی ہجری میں موجود تھا۔ (التنظیمات الاجتماعیہ والاقتصادیہ، محولہ بالا ص ۲۶۴) بہر حال دوسری صدی ہجری سے اس پر فقہی بحثیں شروع ہوئیں۔ اس سے اس دور سے اس کا رواج پانا یقینی معلوم ہوتا ہے۔ سفتجہ پر اولین بحث کے لئے دیکھئے امام محمد بن حسن الشیبانی کتاب الحجہ علی اہل المدینہ حیدرآباد ۱۹۶۵ء جلد ثانی ص ۶۹۰ [2] محسن التنوخی الفرج بعد الشدۃ قاہرہ ۱۹۰۴، جزء ا ص ۱۰۳ [3] ایضاً

شہر میں قیام کے دوران وہ روزانہ اس کے یہاں آتا اور اپنی ضرورت کے مطابق نقد لے جاتا یہاں تک کہ سفتجہ میں مندرجہ تمام رقم ختم ہوگئی[1]

اس دور میں ارسال زر کے اس طریقہ کا رواج اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نقدی نذرانے و تحائف ایک مقام سے دوسرے مقام تک بھیجنے کے لئے بھی یہ مستعمل تھا[2]

سفتجہ کے اس عام استعمال کے علاوہ حکومت کے اپنے کاموں کے لئے اس طریقہ کو اپنانے کی وجہ سے مزید رواج ملا۔ حکومت نے ایک مقام سے دوسرے مقام محاصل کی رقوم منتقل کرنے کے لئے نقدی بنانے کاروں کی فراہم کردہ اس سہولت سے فائدہ اٹھایا۔ اس مقصد کے لئے سفتجہ کے استعمال کی مثالیں اموی دور حکومت میں بھی پائی جاتی ہیں[3] لیکن صوبوں کے مختلف علاقوں سے اس کے صدر مقام اور پھر صوبوں سے مرکز محاصل کی رقوم بھیجنے کے لئے وسیع پیمانہ پر اس نظم پر درآمد عباسی دور کی یادگار ہے۔ اس سے قبل عہد مقتدر کے ایک وزیر علی ابن عیسیٰ کی بابت یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ انہوں نے درباری جہابذہ سے قرض لیتے وقت ان سفاتج کو بطور ضمانت پیش کیا تھا جو صوبوں سے موصول ہوئے تھے۔ لیکن متعینہ مدت کے پورے نہ ہونے کی وجہ سے انہیں داخل کیا نہیں گیا تھا[4] مزید برآں ان کے پیش رو محمد بن عبید اللہ خاقانی کے بارے میں عام شکایت یہ تھی کہ وہ صوبوں سے موصول ہونے والے سفتجہ کے کاغذات پر توجہ نہیں دیتے اور کئی کئی روز تک یوں ہی بند پڑے رہتے ہیں[5]

مشہور تاریخ نویس مسکویہ نے ۹۱۹ء کے حالات کے ضمن میں مرکزی بیت المال پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ اس میں فارس، اصفہان، اہواز اور دوسرے صوبوں سے موصول ہونے والی محاصل کی کثیر رقوم سفاتج کی صورت میں موجود تھیں[6] اس کے علاوہ دسویں صدی عیسوی کی دوسری دہائی میں عباسی حکومت کے محاصل کا تخمینہ بیان کرتے ہوئے یہ ذکر کیا کہ ۹۲۵ء میں مرکزی حکومت نے مصر و شام سے محاصل کی مد میں ایک لاکھ سینتالیس ہزار دینار سفتجہ کے ذریعہ وصول کئے[7] معاصر ماخذ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بعد کے دور میں بھی اہل حکومت میں یہ طریقہ مقبول رہا۔

تیرھویں صدی عیسوی کے ایک مصنف ابن سعید المغربی مصر کے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہاں کے گورنر کو جب بھی کوئی رقم بغداد وزیر کے یہاں بھیجنی ہوتی ہے تو وہ اس شہر میں اپنے ایجنٹ کے نام لیٹر آف کریڈٹ روانہ کر دیتے ہیں جو اس کے عوض تحریر کردہ رقم وزیر کے حوالہ کر دیتا ہے[8]

---

[1] نشوار المحاضرہ و اخبار المذاکرہ محولہ بالا جزء ثانی ص ۱۴۰　[2] الفرج بعد الشدة جزء ثانی ص ۱۰۲　[3] الجہشیاری حوالہ بالا ص ۹۶
[4] الصابی ص ۹۳　[5] ایضاً ص ۲۸۶　[6] مسکویہ جلد ا ص ۱۰ نیز دیکھئے ایضاً ص ۱۰　[7] مسکویہ جلد ا ص ۱۲۶، الصابی ص ۲۱۳
[8] علی ابن سعید المغربی، کتاب المغرب عن حلی المغرب لیڈن ۱۸۹۷ء ص ۳۲

عباسی دور میں محاصل کی رقوم بھیجنے کے لیے سفتجہ کا بکثرت استعمال اس سے بھی بخوبی واضح ہوتا ہے کہ صوبوں سے مرکز سفتجہ کے کاغذات بھیجنے کے لئے مخصوص آفیسر مقرر کیے جاتے تھے۔ جو فیج کے نام سے معروف تھے۔[1]

اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے ماخذ میں تجارتی مقاصد کے لئے سفتجہ کے استعمال کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ لیکن اس امکان سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ تاجروں نے اس سے ضرور فائدہ اٹھایا ہوگا اس لئے کہ دور دراز علاقوں سے خرید و فروخت کے معاملات طے کرنے اور تجارتی غرض سے سفر کے خطرات سے محفوظ رہتے ہوئے نقود کو ایک مقام سے دوسرے مقام منتقل کرنے میں اس نظم کی وجہ سے جو سہولتیں فراہم ہوئیں وہ بالکل ظاہر ہیں۔ اور پھر یہ بھی قابل غور ہے کہ تاجروں کی ضروریات یا دور دراز علاقوں سے تجارت کی مشکلات ہی اس طریقہ کے ایجاد کا باعث بنیں[2] اس لئے تجارتی حلقوں میں اس کا رواج نہ پانا بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے۔ مزید برآں تاریخی کتب میں سفتجہ کے ذریعے دوسرے مقام پر بیع کے عام معاملات طے ہونے کی بعض مثالیں ملتی ہیں۔

الجہشیاری کے بیان کے مطابق منصور کے زمانہ خلافت میں کوفہ کے ایک شخص نے بصرہ میں اپنے ایک دوست کے ذریعہ ایک رہائشی مکان خریدا۔ اور اس کی قیمت نقد ادا کرنے کے بجائے سفتجہ کی وساطت سے روانہ کی۔[3] اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ اس دور میں تاجروں نے بھی اپنے کاروباری مقاصد کے لئے اس کا بھرپور استعمال کیا ہوگا۔ کسی ایک خاص طبقہ کے بجائے مختلف طبقے کے لوگوں میں اس کے رواج پانے کی دلیل اس سے بڑی اور کیا ہو سکتی ہے۔ کہ مفتاح العلوم (عباسی دور میں مرتب کی گئی مصطلحات کی ایک مشہور قاموس) کے مؤلف نے لفظ سفتجہ کی وضاحت ضروری نہ سمجھی۔ اور اس کے آگے صرف "لکھ کر چھوڑ دیا[4]
دو تجربات کے نتیجہ میں اس نظم کے ترقی کرنے کی شہادت اس سے ملتی ہے کہ یہ کچھ خاص اصولوں کے تحت رائج تھا۔ مثلاً سفتجہ کے جاری ہونے کے بعد ایک متعینہ مدت کے بعد ہی اسے نقد میں تبدیل کیا جا سکتا تھا۔[5] اگر صاحب سفتجہ اس مدت سے قبل اسے بھنانا چاہتا تو اسے زر تخفیف ادا کرنا ہوتا تھا[6] اس مدت کے گزرنے کے بعد مندرجہ رقم کو بیک وقت یا بالاقساط لیا جا سکتا تھا[7] عام لوگوں کے لئے سفتجہ کے طریقہ کو قابل عمل بنانے میں تاجر یا صراف یا جہبذ سہولتیں بہم پہنچاتے تھے۔ حکومت کے لئے ان کے اپنے درباری بنک کار یہ

---

[1] مسکویہ جلد ا صد ۱۵۰ [2] ماہرین لغت اور فقہا نے اس کی تشریح کرتے وقت مثال کے طور پر تاجروں کے ذریعہ اس کے استعمال کا ذکر ہے تفصیل کے لیے راقم الحروف کا مضمون سفتجہ کی شرعی حیثیت پڑھئے [3] الجہشیاری محولہ بالا صد ۶۵-۶۶
[4] محمد خوارزمی مفتاح العلوم بریل ۱۹۶۸ صد ۶۳ [5] الصابی صد ۳۴۹ تنوخی الجزء الثانی ص ۱۳۱ [6] الصابی صد ۳۴۹ [7] تنوخی محولہ بالا صد ۱۳۱۔

خدمت انجام دیتے تھے۔

عباسی دور میں بینکنگ سرگرمیوں کا ایک اور پہلو مختلف اغراض و مقاصد کے لئے نقد ادائیگی کے بجائے چک اور رقعہ کا استعمال تھا۔ ادائیگی کے اس طریقہ کو قابل عمل بنانے اور اسے رواج دینے میں بھی انفرادی بنک کاروں کا خاص رول تھا۔ اس کے استعمال کی ابتداء عام طور پر اسلامی تاریخ کے اولین دور یا پہلی صدی ہجری سے منسوب کی جاتی ہے[1] لیکن خرید و فروخت کے معاملات طے کرنے، مالی مدد فراہم کرنے اور حکومت کی جانب مستحقین کو وظائف دینے اور افسران حکومت کو تنخواہ دینے کے لئے اس کا رواج عباسی دور میں شروع ہوا۔ اس سے قبل یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ اصحاب ثروت بالخصوص حکومت کے متعلقین انفرادی بنک کاروں کے پاس اپنی رقمیں جمع کرتے تھے۔ یہ حضرات اپنی نجی ضروریات کے وقت یا کسی کو دینے کے لئے ان کے نام اکثر چک جاری کرتے تھے۔ بنکر بلا خوف و خطر اسے تسلیم کرتے تھے اور اس کے عوض مندرجہ رقوم متعلقہ شخص کے حوالہ کر دیتے تھے۔ صاحب کتاب الوزراء ہارون رشید کی بابت کرتے ہیں کہ خلیفہ نے اپنے وزیر فضل بن یحییٰ کی سفارش پر امام محمد بن ابراہیم پر انعام اکرام کیا اور نقد کی بجائے چک کی صورت میں ایک لاکھ درہم پیش کیا[2]۔

عہد معتمد کے وزیر سلیمان بن وہب اور ان کے بیٹے عبد اللہ کے خاص بنکر لیث تھے۔ تنوخی کے بیان کے مطابق یہ اپنی ضروریات کے لئے لیث کے نام چیک جاری کیا کرتے تھے[3]۔

مقتدر کے دور کے وزیر ابن الفرات کے بارے میں دوسرے مآخذ سے یہ شہادت فراہم ہوتی ہے کہ ان سے اپنے پیشرو اور معزول وزیر علی ابن عیسیٰ کی مالی اعانت کے لئے دو ہزار دینار کا چک بھیجا جو کہ اس کے بنکر ہارون بن عمران کے نام جاری کیا گیا تھا[4]۔ مزید برآں اسی وزیر کی بابت یہ ثبوت بھی ملتا ہے کہ اس نے اپنی تیسری وزارت کے دوران ۹۲۳ء میں ابن ابی البغل نامی ایک شخص کے لئے تین ہزار دینار کا چک جاری کیا تاکہ وہ اپنی ضروریات رفع کر سکے[5]۔

مسکویہ بویہہ کے امیر سیف الدولہ کے ۹۴۱ء میں بغداد کے سفر کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ کہ اس سفر کے دوران نبی خاقان کے بعض نوجوانوں نے بغیر پہچانے ہوئے ایک اجنبی کی حیثیت سے ان کی کافی خاطر تواضع کی۔ اس عمل سے خوش ہو کر مذکور امیر نے انہیں رخصت کے وقت سو دینار کے چک سے نوازا[6]۔

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے دوری، التنظیمات الاجتماعیہ والاقتصادیہ، محولہ بالا صد ۱۷۷، ۱۷۸۔ [2] الجہشیاری صد ۱۵۱
[3] تنوخی، محولہ بالا صد ۵۰ [4] الصابی صد ۳۳۳، مسکویہ جلد اول صد ۱۱۳ [5] الصابی صد ۸۴
[6] مسکویہ جلد دوم صد ۲۳۹۔

عباسی دور بالخصوص چوتھی صدی ہجری (دسویں صدی عیسوی) میں چیک کے استعمال کی کثرت پر مزید ثبوت صاحب ارشاد الاریب یاقوت الحموی کی تحریروں سے فراہم ہوتا ہے۔ انہوں نے اہل ذوق اور علم دولت دولتمندوں کی جانب سے شاعروں اور مغنیوں کو نقد کے بجائے چیک کی صورت میں نوازنے کی متعدد مثالیں بیان کی ہیں[1]۔ مشہور مورخ و جغرافیہ داں مسکویہ اور ابن حوقل کے بیانات سے عباسی دور میں عرب و افریقی ممالک میں چیک کے کثرت استعمال کی مزید تصدیق ہوتی ہے[2]۔ معاصر مآخذ کی تفصیلات سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت بعض اوقات فوجیوں کو تنخواہ دینے یا مستحقین کو وظائف عطا کرنے کے لئے اسی طریقۂ ادائیگی کو ترجیح دیتی تھی[3]۔ ایرانی سیاح ناصر خسرو نے اپنے سفرنامہ میں بعض دوستوں سے چیک وصول کرنے کا اپنا ذاتی تجربہ بیان کیا ہے[4]۔ اور مصر کی جامع مسجد پر تبصرہ کرتے ہوئے اس کے زائرین میں خصوصیت کے ساتھ کاتبانِ چیک کا ذکر کیا ہے[5]۔ یہ تمام واقعات و بیانات عباسی دور میں چیک کے کثرت استعمال اور رواج کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں اور ان سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ انفرادی بنک کار ہی اس کام میں مدد و معاون ثابت ہوتے تھے۔ حکومت کے اپنے چیک درباری بنکروں یا بیت المال کے نام تحریر کئے جاتے تھے جب کہ عام اصحابِ ثروت ان بنک کاروں کا حوالہ دیتے تھے جن کے یہاں ان کی رقوم جمع ہوتی تھیں۔

عباسی دور کی انفرادی بنک کاری پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ ذکر اہمیت سے خالی نہ ہوگا کہ اس پیشہ کو اختیار کرنے والوں میں اکثریت یہودیوں اور عیسائیوں کی تھی۔ عبدالعزیز دوری کے خیال میں تیسری صدی ہجری کے آخر تک اکثر جہابذہ و صراف عیسائی تھے۔ چوتھی صدی سے ان مشاغل میں یہودیوں کو غلبہ حاصل ہوا[6]۔ بہرحال مآخذ میں اس دور سے متعلق جن بنک کاروں کا حوالہ ملتا ہے ان میں اکثریت یہودیوں کی نظر آتی ہے جیسا کہ مقدسی کے اس بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔

"اکثر جہابذہ و صراف یہودی ہیں اور اطباء میں اکثریت نصاریٰ کی ہے"[7]

مآخذ سے یہ ثبوت بھی ہم پہنچتا ہے کہ یہ بنک کار سفتجہ کے عوض نقد دیتے وقت یا چیک کے بھناتے وقت زرِ تخفیف یا کمیشن کے طور پر اصل رقم سے فی دینار ایک درہم کے حساب سے کاٹ لیتے تھے[8]۔ ان بنک کاروں

---

[1] یاقوت الحموی ارشاد الاریب الی معرفۃ الادیب لیڈن ۱۹۰۷ء، جلد ۱ ص ۳۸۵، ۳۹۹ [2] ابن حوقل، کتاب المسالک و الممالک لیڈن ۱۸۷۳ء ص ۴۲، ۷۰، ۱۷۷، ۹۹ مسکویہ جلد دوم ص ۸ [3] مسکویہ ج ۳ ص ۴۶ الصابی ص ۸۹، ۲۵۷ [4] ناصر خسرو، سفرنامہ پیرس ۱۸۸۱ء ص ۴۲ [5] ایضاً [6] دوری محولہ بالا ص ۱۷۳ [7] المقدسی، احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم بیروت ۱۹۰۶ء، ص ۱۸۳ نیز دیکھئے ابو یوسف کتاب الخراج القاہرہ ۱۳۵۳ھ ص ۱۳۳ تاریخی مآخذ میں مسلم صرافوں یا جہبذوں کے بعض حوالے بھی ملتے ہیں ابن الاثیر جلد نہم ص ۱۴۷ یاقوت الحموی ص ۱۳۵ تنوخی ج ۱ ص ۲۷۲ مسکویہ ج ۲ ص ۳۰ [8] تنوخی ج ۱ ص ۱۲ یاقوت الحموی ج ۱ ص ۳۹۹ مسکویہ ج ۲ ص ۲۲۹

الحق

جانب سے بنکنگ سر کے عوض معاوضہ وصول کرنے کا دستور اس سے بھی صحیح ہوتا ہے۔ دسویں صدی یہودی
میں عباسی حکومت کے عائد کردہ محاصل کی فہرست میں مال جہبذہ کا ذکر ملتا ہے۔ قرین قیاس یہی معلوم ہوتا ہے کہ
حکومت اس کی مد آمدنی کو اپنے مخصوص بنک کاروں کی خدمات کا معاوضہ دینے میں صرف کرتی تھی[1] مزید برآں
بعض مورخین نے جہابذہ یا انفرادی بنک کاروں کی کثیر دولت کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے[2] اس میں یقیناً دیگر
ذرائع آمدنی کے ساتھ بنک کاری کے مشاغل سے حاصل ہونے والے منافع بھی شامل رہے ہوں گے۔

عباسی دور میں جہابذہ وصراف بنیادی طور پر انفرادی حیثیت میں بنک کاری کے مشاغل انجام دیتے تھے
لیکن ان کی بعض بنکنگ تنظیم یا فرم کا محدود تصور بھی ملتا ہے۔ بغداد کے دونوں مشہور بنکروں ہارون بن عمران
اور یوسف بن فنحاس کا مشترکہ کاروبار کچھ اسی نوعیت کا تھا ان کے نمائندے و ایجنٹ مختلف شہروں میں موجود
تھے۔ اور ان کی وساطت سے وہ تجارتی کاروبار کے علاوہ بنکنگ مشاغل بھی انجام دیتے تھے۔ اور اشتراک عمل،
کی وجہ سے بالعموم "الجہبذان الیہودان" کے لقب سے معروف تھے۔ اور ماخذ میں بھی یہ اکثر اسی نام سے ذکر
کئے جاتے ہیں[3]

دلچسپ اور اہم بات یہ کہ حکومت بھی انہیں ایک فرم کی حیثیت سے تسلیم کرتی تھی۔ قرض کے لین دین کا مسئلہ
پیش ہوتا یا اور کوئی معاملہ ہوتا تو دونوں دربار میں طلب کئے جاتے۔ اور دونوں کو مشترکہ طور پر معاہدہ میں شریک کیا
جاتا مزید برآں خلاف ورزی کی صورت میں دونوں ہی تادیبی کارروائی کے موجب قرار دئے جاتے[4] ان کی فرم کی
نوعیت اس سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ حکومت کے ساتھ معاہدوں میں ان دونوں کے ساتھ ان کے ورثہ و نمائندوں کو
بھی شریک تصور کیا جاتا تھا[5]۔ اور وہ بھی اس کے نکات کی پابندی کے ذمہ دار قرار دئے جاتے تھے[6] اس کے علاوہ
مصر کے سہل برادران (یا بنو سہل) عباسی دور کی دوسری بینکنگ فرم سے تعبیر کئے جا سکتے ہیں۔ ظاہر و مستنصر
کے زمانہ میں یہ دربار کے بنکر مقرر ہوئے تھے۔ اور حکومت کے لئے مشترکہ طور پر بنکنگ خدمات انجام دینے کے
علاوہ ایک فرم کی حیثیت سے دوسروں کو بھی بنکنگ سہولیات بہم پہنچاتے تھے[7]

---

[1] الصابی ص ۹۳، ۳۷۷، ۳۱۶، مقریزی، کتاب الخطط والآثار، بولاق ۱۲۷۰ھ ج ۱ ص ۲۷۲، القمی تاریخ قم، تہران ص ۱۴۹، ۱۵۱، ایپکا پوڈینا
محولہ بالا ص ۳۸ [2] جہشیاری ص ۷۹ [3] الصابی ص ۷۹، ۸۱، ۹۱، ۱۷۷، تنوخی، الجزء الثانی ص ۸۱، ۸۲، یاقوت
الحموی ص ۴۷۔ مسکویہ جلد اول ص ۱۲۸ [4] الصابی ص ۹۲، ۹۳، ۱۹۸۔ تنوخی الجزء الثانی ص ۲۳، ۲۶
[5] الصابی ۹۲۔ ۹۳۔ تنوخی ص ۲۳۔ ۲۵ مسکویہ جلد اول ص ۱۲۸ [6] مسکویہ ۴۹۳ [7] مقریزی جلد اول ص ۳۵
تا ۴۳۴۔

بنکنگ تنظیم یا فرم کی ان بنیادی شکلوں کے علاوہ عباسی دور میں بنکنگ سرگرمیوں پر یہ بھی دلالت کرتا ہے کہ اس وقت بڑے بڑے شہروں میں بعض محلہ جات جہبند و صرافین یا بنک کاروں کے لئے مخصوص ہوتے تھے۔ بغداد کے مشہور بازار کرخ میں ان کا مرکز درب العون یا عون اسٹریٹ تھا۔[1] اس سے قبل بصرہ کی بندرگاہ کے قریب مشہور تجارتی مرکز دارالزبیر کا ذکر کیا جا چکا ہے جہاں سفتجہ کے ذریعہ رقوم کی منتقلی اور سفتجہ یا بل آف ایکسچینج کو نقد میں تبدیل کرنے کا بھی انتظام تھا۔[2] ناصر خسرو نے اصفہان کے حالات کے ضمن میں درج کیا ہے کہ ان سے وہاں تقریباً دو سو افراد کو دیکھا جو مختلف بنکنگ اعمال میں مصروف تھے۔[3]

مذکورہ بالا تفصیلات کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ عباسی دور میں انفرادی بنک کاری کے خاص ارکان ناقد، جہبند و صراف تھے۔ یہ جمع رقوم قرض، ہنڈی اور سفتجہ کے ذریعہ ادائیگی وغیرہ جیسے امور انجام دیتے تھے۔ جو آج بھی ترقی یافتہ صورت میں بنکنگ اعمال کا حصہ ہیں۔ انفرادی بنک کاری سے مختلف پہلوؤں سے عام مسافر، تاجر اور اہل ثروت فائدہ اٹھاتے تھے۔ اور حکومت بھی اپنے کاموں کے لئے ان کی سرگرمیاں استعمال کرتی تھی۔ انفرادی بنک کاری کے جائزہ سے ایک دلچسپ پہلو یہ سامنے آتا ہے کہ اس میں وسعت و ترقی اس دور میں رونما ہوئی جب کہ حکومت زوال کا شکار ہو رہی تھی۔ اس کی ظاہری وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ زوال کے دور میں جب حکومت معاشی بدحالی سے دوچار ہوئی۔ آمد و خرچ میں توازن کے لئے جب یہ وسائل درکار ہوئے تو ان کی تکمیل کے لئے اور ہنگامی ضروریات کے وقت مالی فنڈ کی فراہمی کے لئے ان کی خدمات زیادہ سے زیادہ حاصل کی گئیں۔ اور اس مقصد کے تحت انفرادی بنک کاروں کو سہولتیں بھی کافی فراہم کی گئیں ان اسباب سے ان کے بنکنگ مشاغل کا دائرہ کار وسیع ہوا۔ اور دوسری جانب ان کی سرگرمیوں میں اضافہ کی وجہ سے تجارتی اور کاروباری حلقہ میں بنکنگ اعمال کو اور رواج ملا یہاں تک کہ یہی آیندہ کے ترقی یافتہ بنکنگ نظام کی بنیاد بن گئے۔

---

[1] مسکویہ جلد اول صہ ۱۴۷/۱۴۸، تنوخی الجزء الاول صہ ۲۰۴، یاقوت الحموی جلد اول صہ ۳۹۹، الجہشیاری صہ ۱۸۰ نے اسی کو درب الصیارفہ کے نام سے ذکر کیا ہے۔ [2] تنوخی الجزء الثانی صہ ۱۳۱ [3] سفرنامہ صہ ۱۲۳

کارمینا
نظام ہضم کو بیدار کرتی ہے،
معدے اور آنتوں کے افعال کو
منظم و درست کرتی ہے۔
Carmina
ہمدرد
ہم خدمت خلق کرتے ہیں
کارمینا ہمیشہ گھر میں رکھیے۔
آواز اخلاق
بہترین انسان وہ ہے جس کا وجود انسان کے لیے مفید ترین ہو
Adarts CAR-2/84

ڈاکٹر شبیر بہادر خان صاحب پنی ۔ ایبٹ آباد

مولانا ابو الکلام آزادؒ

۱۸۸۸ء —— ۱۹۵۸ء

اُن کی کتاب زندگی کے چند اوراق

؎ حکایت ز قدّ آں یار دلنواز کنیم — بایں فسانہ مگر عمر خود دراز کنیم

اس عبقری زمانہ نے لوگوں کی چہ میگوئیوں پر ایک دفعہ لکھا :۔

" میرے بارے میں کسی نہ کسی طرح دو رائیں بنتی چلی گئیں ۔ کچھ لوگ مجھ سے ارادت رکھتے ہیں یہ اُن کے دل کی فیاضی ہے بعض لوگ مجھے دشنام سے یاد کرتے ہیں یہ ان کے دل کی ناراضی ہے ۔

میں کیا ہوں اور کیا نہیں ۔ اس کا فیصلہ آج نہیں کل ہوگا ۔ میں نے اپنی زندگی ایک کھلی کتاب کی طرح لوگوں کے سامنے رکھ دی ہے ۔ یہ اوراق اُنہیں اس امر کا فیصلہ کرنے میں مدد دیں گے کہ کتنا بُرا اور کتنا اچھا ہوں " ابو الکلام

فرانس کے مشہور مصنّف وکٹر ہیوگو ۔ نے والٹیر کی صد سالہ یادگار مناتے ہوئے کہا تھا :۔

" زندگی کتنی ہی شاندار اور عظیم ہو ، لیکن تاریخ اپنے فیصلہ کے لئے ہمیشہ موت کا انتظار کرتی ہے "

مولانا آزاد کی موت کو اب ۲۷ برس ہوگئے ہیں ۔ آؤ دیکھیں تاریخ کا فیصلہ کیا ہے ؟

<u>ان کی زندگی کے اوراق</u> | ۱ ۔ آپ نے مشہور پیر گھرانے میں آنکھ کھولی ۔ عقیدت ، دولت اور عزت ان کے گھر کی باندی تھی ۔ لوگ ہاتھ چومتے اور ملاقات کے بعد اُلٹے پاؤں (پُشت کئے بغیر) واپس ہوتے ۔

یہ معلوم ہے کہ مشائخ کی گدی ، شاہی تخت سے کہیں بالاتر ہے ۔ وہاں حکومت دلوں پہ ہوتی ہے اور یہاں جسموں پر ۔ فرق ظاہر ہے دلوں پہ حکومت دائمی اور جسموں پہ عارضی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ بادشاہِ وقت ، اپنے ملک کے مشائخ کے اثر و رسوخ کو ہمیشہ شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے رہے ۔ اور ان سے ترساں اور لرزاں رہے ۔

لیکن مولانا آزادؒ نے یہ گدی ، رضا و رغبت سے چھوڑ دی جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی ۔ معتقدان و مریدان کے اصرار کے جواب میں فرمایا :۔

" وہ میرے والد کا طریق تھا ۔ میں اس راہ کا آدمی نہیں "

۲۔ آپ نے "الہلال" جاری کر کے صحافتی دنیا میں انقلاب پیدا کر کے، اس کو ایک طاقت بنا دیا۔ علامہ عنایت اللہ المشرقی نے کہا:۔

" جو اخبار بڑی طاقت بن کر غائب ہو گئے۔ مثلاً سرسید کا "تہذیب اخلاق"، غلام محمد مرحوم کا "وکیل" یا محترم ابوالکلام آزاد کا "الہلال"۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی (علی گڑھ) لکھتے ہیں: " مولانا آزاد کی تحریر صحافتی نہیں تصنیفی ہوتی ہے۔ نظر حکیمانہ، انداز خطیبانہ اور رنگ ملہمانہ۔۔۔۔۔"

۳۔ داعیِ قرآن و تبلیغ جہاد کا فریضہ اس جرأت و بیباکی سے کیا کہ دنیا کی سب سے بڑی حکومت وقت کو لرزا دیا۔ اور اس کا رعب دلوں سے اٹھا دیا۔ اور ۳۰ سال بعد حکومت کو جسموں سے بھی اٹھا دیا۔

۴۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کا اعتراف:۔ " اس نوجوان نے ہمیں اپنا بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا۔" اور اپنی زندگی کے چراغ گل ہونے سے پہلے فرمایا:۔ "ابوالکلام کے ہاتھ پر بیعت امامت کی جائے۔"

۵۔ مقام خودی | تقسیم برصغیر پاک و ہند کے فیصلہ کے مطابق، ہندوستان میں جشن آزادی ۱۵ اگست منانے کا دن تھا۔ اس سے تین چار دن پہلے چودھری خلیق الزمان اور نواب اسمٰعیل خان میرٹھی (مسلم لیگ کے چوٹی کے رہنما) مولانا آزاد کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور پیش آمدہ حالات کی تلخیوں کا ذکر کرتے ہوئے تجویز پیش کی۔ کہ ۱۴ اگست کو دہلی میں مسلمانوں کا ایک اجتماع عظیم کر کے سردار پٹیل اور پنڈت نہرو کو سپاس نامہ پیش کرنا چاہئے۔

مولانا آزاد نے فرمایا:۔ "میرے بھائی! خوشامد کا یہ کاغذی نوشتہ، پیش آمدہ مسائل کا حل نہیں ہے۔ ہم اپنی قوم کی خودی کو داغدار کئے بغیر اپنی مشکلات پر قابو پا سکتے ہیں۔"

۶ جب تقسیم ملک کے بعد مسلمان ہندوستان سے خوف و ہراس کے عالم میں بھاگنے لگے تو ان کو۔۔۔۔ دہلی کی شاہجہان کی مسجد میں بلا کر تقریباً ۳۵ ہزار کے مجمع سے خطاب فرمایا۔

یہ دیکھو! مسجد کے مینار تم سے جھک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیا ہے؟ ابھی کل کی بات ہے کہ یہیں جمنا کے کنارے تمہارے قافلوں نے وضو کیا تھا۔ اور آج تم ہو کہ تمہیں یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے۔ حالاں کہ دہلی تمہارے خون سے سینچی ہوئی ہے۔

عزیزو! تبدیلیوں کے ساتھ چلو۔ یہ نہ کہو کہ ہم اس تغیر کے لئے تیار نہ تھے۔ بلکہ تیار ہو جاؤ۔ ستارے ٹوٹ گئے لیکن سورج تو چمک رہا ہے۔ اس کی کرنیں مانگ لو۔ اور ان اندھیری راہوں میں بچھا دو۔ جہاں اجالے کی سخت ضرورت ہے۔

باد صرصر اٹھی، تو مسلمانوں نے اس کا رخ پھیر دیا۔ آندھیاں آئیں تو ان سے کہا، تمہارا راستہ یہ نہیں ہے۔ یہ

ایمان کی جان کنی ہے۔ کہ شہنشاہوں کے گریبانوں کے تار بیچ رہے ہو۔ اور خدا سے اس درجہ غافل ہو گئے جیسے اس پر کبھی ایمان ہی نہ تھا۔

عزیزو! میرے پاس تمہارے لئے کوئی نیا نسخہ نہیں۔ چودہ سو برس پہلے کا پرانا نسخہ ہے وہ نسخہ جس کو کائنات انسانی کا سب سے بڑا محسن لایا تھا۔۔۔۔ اور اس نسخہ قرآن کا یہ اعلان "لاتہنو ولاتحزنوا وانتم اعلون ان کنتم مومنین۔ آج کی صحبت ختم ہو گئی مجھے جو کچھ کہنا تھا وہ اختصار کے ساتھ کہہ چکا۔ پھر کہتا ہوں، بار بار کہتا ہوں۔ اپنے حواس پر قابو رکھو۔ اپنے گرد وپیش اپنی زندگی خود فراہم کرو۔ یہ منڈی کی چیز نہیں کہ تمہیں خرید کر لا دوں۔ یہ تو دل کی دکان ہی سے اعمال صالحہ کی نقدی پر دستیاب ہو سکتی ہے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ۵

زباں ز نطق فرو ماند و رازِ من باقی است
بضاعت سخن آخر شدہ سخن باقی است

۷۔ خان عبدالغفار خان (باچا خان) اپنی "آپ بیتی" جو انہوں نے خود لکھوائی، میں یوں اظہار خیال کرتے ہیں:-

"جب کانگرس نے تقسیم ملک پر اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے انہوں نے تمام پٹھانوں کو موت کی سزا سنا دی۔ میں بے حد پریشان تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد میرے قریب بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ اب آپ کو مسلم لیگ میں شامل ہو جانا چاہیئے"

اگر باچا خان اُس وقت مولانا آزاد کا یہ مشورہ قبول کر لیتے تو یقیناً اُن کی پارٹی، قوم اور ملک کے لئے بہتر ہوتا۔ لیکن انہوں نے نہ مانا اور انجام سامنے ہے۔

۸۔ رام گڑھ کانگرس اور مولانا آزاد کا خطبہ صدارت فرمایا: "میں مسلمان ہوں اور فخر سے اعلان کرتا ہوں کہ اسلام کی تیرہ سوسالہ روایتیں میرے حصہ میں آئی ہیں۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ ضائع کر دوں۔ اسلام کی تاریخ، اسلام کی تعلیم، اسلام کی دولت، اسلام کے جملہ اصول، اسلام کی تہذیب، میری دولت ہے۔ اور یہ میرا فرض ہے کہ میں اس کی حفاظت کروں۔ مذہبی اور ثقافتی دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں۔ میں برداشت نہیں کر سکتا کہ اس میں کوئی کسی قسم کی مداخلت کرے"

۹۔ مولانا آزاد کی دعوت خاص طور پر دو امور کی جانب تھی۔ ۱۔ دعوتِ قرآن ۲۔ دعوت جہاد۔ اور اس پر وہ آخر دم تک قائم رہے۔

مولانا آزاد کے سخت ترین ناقد اپنے اخبار "صدق جدید" مورخہ ۲۶ جولائی ۱۹۶۸ء میں ان کی ایک تقریر ۱۹۴۷ء کے حوالے سے لکھتے ہیں:-

"عزیزو! میرے پاس تمہارے لئے کوئی نیا نسخہ نہیں ہے۔ ۱۴ سو برس پرانا نسخہ ہے جس کو کائنات انسانی

کا سب سے بڑا محسن لایا تھا۔ اور وہ نسخہ قرآن ہے جس کا اعلان ہے:۔ لَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ
نہ ودہیں اور نہ غمزدہ بنو۔ تمہیں غالب آؤ گے اور تم مومن رہے۔

اس تقریر پر مولانا عبدالماجد دریابادی، حاشیہ چڑھاتے ہیں۔
خوب خیال کر لیجئے یہ تقریر ان مولانا ابوالکلام آزاد کی ہے جو ۱۹۴۷ء میں مرکزی وزیر رہ چکے ہیں یا وزیر بننے جا رہے تھے۔ اور ہند کو سوراج حاصل ہو چکا تھا۔ " آج کوئی کاش اتنا کہنے والا بھی ہوتا، مولانا کو نہ یہ خوف یا کہ کوئی ان کو سیکولرزم کا طعن کرے گا۔ نہ اس کا اندیشہ پیدا ہوا کہ کوئی ان کی فرقہ پرستی کا چرچا شروع کر دے گا۔

۱۰۔ جب ہندوؤں پر مولانا آزادؒ کی مسلم نوازی پر، چند حلقوں پر دبی زبان سے چہ میگوئیاں ہونے لگیں تو آپ نے بھارتی ایوان (پارلیمنٹ) کے اجلاس ۱۹۵۴ء میں تقریر کی۔ " میں لیپا پوتی کی باتیں نہیں کر رہا۔ اس قسم کی باتیں وہ کرتا ہے جس میں غرض کا مادہ پایا جاتا ہے۔ میرے اندر کوئی غرض نہیں۔ میں اس تصور سے ہی نا آشنا ہوں۔ اب سے ۴۶ برس پہلے جب میری عمر ۱۸ یا ۱۹ برس تھی۔ میں نے اپنی زندگی کا ایک نقشہ بنایا تھا اس وقت سے آج تک میری زندگی ایک کھلی کتاب ہے۔ اور آپ جانتے ہیں اس کتاب کا کوئی صفحہ نہ تو حوادث و وقائع کی دست درازیوں سے چاک ہوا نہ میں نے کبھی زمانے کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کی کوشش کی۔ اور نہ ہی کبھی حالات کے بہاؤ میں بہنے کے لئے اپنے آپ کو موجوں کے سپرد کیا ہے۔ زندگی کا ایک بڑا حصہ ختم ہو چکا ہے۔ اور جو باقی ہے وہ تھوڑا اور قریب الختم ہے۔ (آپ کی وفات ۱۹۵۸ء میں ہوئی)

۱۱۔ جب پاکستان بن گیا تو مشرقی و مغربی پاکستان کے ہر مسلمان کو تلقین کی
" اب جب کہ پاکستان قائم ہو چکا ہے اس کی حفاظت اور استقلال کی ذمہ داری تم پر عائد ہوتی ہے۔ جو اس خطے میں رہتے ہیں " اور پھر ہندوستان کے قابل و اہل مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ پاکستان جا کر اس کو مضبوط بنانے کی کوشش کریں۔ اور اکثر فرماتے۔ " پاکستان بن چکا۔ اب اس کی حفاظت ہر مسلمان پر فرض ہے "
جب مشرق وسطیٰ کے دورے پر گئے تو واپسی پر کراچی آئے قائد اعظم کے مزار پر پھول چڑھائے اور فاتحہ خوانی کی۔

۱۲۔ مولانا مہر اپنے ایک خط بنام سید انیس شاہ جیلانی ساکن محمد آباد تحصیل صادق آباد (بہاول پور) لکھتے ہیں۔
" بھائی! مولانا کی وفات دورِ حاضر کا بہت بڑا حادثہ ہے ..... مولانا کا علم و فضل ان کی نظر و بصیرت ان کے تصورات و افکار دین و اخلاق اور سیاست و علم کی بنیادی اقدار کے باب میں ان کے اندازے اور ان کے معیار اب ہم کہاں پائیں گے۔ وہ گئے تو ذہنی روشنی کی پوری کائنات اپنے ساتھ لے گئے۔ ایسی روشنی کا مینار

کھڑا ہونے کے لئے اللہ تعالیٰ کے اپنے فضلِ خاص کے بعد کئی عمریں اور کئی سیر ہونے چاہئیں۔ اس لئے کہ ایسی شخصیتیں ہر عہد اور ہر عصر کو نصیب نہیں ہوتیں..... مولانا کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضلِ خاص سے یہ مقام بلند فرمایا تھا اس کی کوئی نظیر متعدد گزشتہ صدیوں میں نظر نہیں آتی۔ پھر ان کی جامعیت، ہر دائرے میں مرتبہ بلند پر فائز، ان سب مفاہیم الٰہی کے بعد اپنے معتقدات کے لئے عمل کی اہمیت، ان پر کاربندی کی مردانگی اور راہِ حق و صداقت میں ہر قسم کی تکلیفیں جھیل لینے کی لامتناہی استطاعت میں، میں نے کوئی شخص نہیں دیکھا جس نے تیس برس کی عمر میں دنیا بھر کی آنکھیں فرطِ عقیدت سے اپنے لئے فرشِ راہ دیکھی ہوں۔ پھر جب معتقدات کے لئے مجاہدے کا وقت آیا تو ہر ولعزیزی کی ہر متاع بے دریغ قربان کر دی ہو۔ یہاں تک کہ وہ اس اقلیم کا معتوب ترین آدمی رہ گیا ہو۔ بایں ہمہ معتقدات کی مشعل ہاتھوں میں لئے کھڑا ہو...“

۱۳۔ عہدِ حاضر کے ایک عالم و محقق کی رائے تحریر کرتا ہوں۔

”اسلامی قرآنی حکومت کے قیام کی جدوجہد جاری ہے۔ پوری قوم اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہی ہے اور کبھی کسی کو روشنی کی کوئی کرن نظر آجاتی ہے تو وہ فکرِ آزادؒ ہی کی پھیلائی ہوئی روشنی اور ہدایت ہوتی ہے پاکستان (جو اس اقلیم کی معتوب ترین آدمی بن کر رہ گیا تھا) میں اس پر پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کر لی گئی ہے۔ اس اعلیٰ ترین اعزاز و سند کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ کئی ایم۔ اے کے لئے مقالے لکھے گئے۔ دسیوں کتابیں حضرت کے افکار و سیرت پر مرتب اور شائع ہو چکی ہیں۔“

گویا مولانا آزادؒ کے قول کے مطابق، ان کی کتابِ زندگی کی اوراق کی روشنی میں فیصلہ سنا دیا گیا ہے کہ وہ کتنے بُرے اور کتنے اچھے تھے۔

مضمون اختتام کو پہنچا۔ گو ابھی اوراق کا ذکر ہی کیا جا سکا۔ مگر ؎

زباں ز نطق فرو ماند و رازِ من باقی است
بضاعتِ سخن آخر شد و سخن باقی است

یہ چند سطور اہلِ علم و صاحبِ دل اصحاب کی یاد دلاتی اور معتقدانِ آزادؒ کو سلام کرنے کے لئے تحریر کر دی گئیں ؎

بآں گروہ کہ از ساغر وفا مستند
سلامِ ما برسانید ہر کجا ہستند